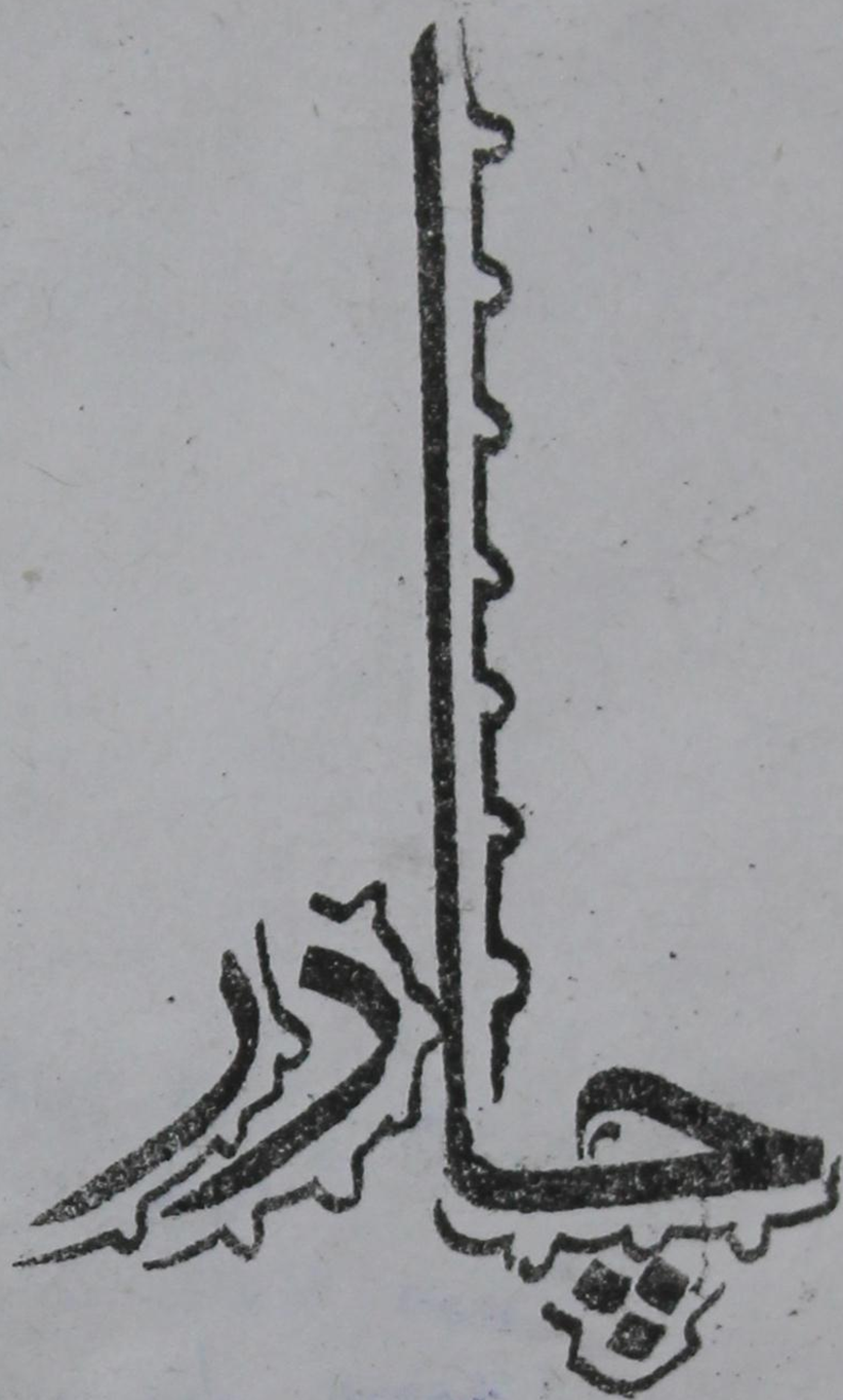

چادر





مُصنّف ...... خوش دلیو

انتساب

مہربان چاچا

ہربنس لال مینی

کے

نام

خوشتر دیو

اس کتاب کی اشاعت کے لئے مصنّف
کو جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اور لنگویجز کی
جانب سے ۶۵۵/ روپے کی گرانقدر امداد حاصل
ہوئی ہے جس کے لئے مصنّف اکیڈمی کا نہایت ممنون
مشکور ہے۔

نام	چادر
مصنّف	خوش دیو
سال اشاعت	۱۹۷۹ء
پبلشر	خوش دیو
طباعت	شاردا پرنٹنگ پریس جموں
کتابت	کے. ایل گپتا
تعداد	پانچسو
قیمت فی جلد	دس روپے (۱۰)

دیباچہ

اردو میں مختصر افسانے کے رجحانات اور نقوش اگرچہ
۱۹ ویں صدی کی آخری دہائیوں سے ملنے لگتے ہیں لیکن اس کی
باقاعدہ ابتدا ۲۰ ویں صدی کے آغاز بلکہ پہلی جنگِ عظیم سے ہوتی
ہے یہ صحیح ہے کہ اردو افسانے پریم چند سے پہلے ہی سے ملنے لگتے ہیں
اور "دلگداز" "اودھ پنچ" "تعارف" "علی گڑھ منتھلی" "خاتون" "خدنگ نظر"
اور "مخزن" وغیرہ رسائل میں افسانے لکھے جانے لگے تھے۔ لیکن صحیح
معنوں میں افسانوں کو واضح شکل پریم چند ہی نے دی۔ پریم چند کی
طبع زاد کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے جون ۱۹۰۸ء
میں شائع ہوا جو باغیانہ جذبات پھیلانے کے جرم میں ضبط ہو گیا لیکن
انہوں نے حقیقت نگاری کے جو نت نئے پیکر تراشے اور تصور پرستی
اور مثالیت کے دھندلکوں سے نکل کر جس طرح طبقاتی جنگ کو

ہندوستانی سماج کی ایک کھلی ہوئی حقیقت کے طور پر شناخت کیا اس نے نئے لکھنے والوں کو قوت، تازگی اور واضح رہنمائی عطا کی۔ ان کی کہانیوں میں ہندوستانی قصوں کی بیانیہ سادگی فطری آسائش اور اخلاقی قدروں کا جو دلنشین امیج ملتا ہے اس نے اردو کہانیوں کو واضح شکل دینے اور جلد از جلد ارتقا کے لئے خونِ تازہ کا کام کیا۔ اس طرح پریم چند نے اردو کہانیوں کو جو رنگ و روغن عطا کیا۔ اس کی جھلملاتی عکس ریزیاں آج بھی بہت سے نوجوان افسانہ نگاروں کے یہاں سماجی آئینوں سے سجے ہوئے واقعات اور بیانات میں نظر ہی نہیں آتیں اپنی ست رنگی روشنیوں سے ذہن و نظر کو منور کئے ہوئے ہیں۔

پریم چند کی اس روایت سے مہاشے سدرشن، اعظم کریوی علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی نے کافی اثر لیا۔ ادب لطیف کے رجحان کے تحت جو افسانے لکھے گئے ان میں یلدرم اور نیاز کے علاوہ مجنوں گورکھپوری کے افسانے قابل ذکر ہیں۔ حسن پوش، خواب و خیال اور حسن کا انجام۔ سب شاعرانہ فکر و تخیل کے کرشمے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے قریب انگریزی کے علاوہ روسی کہانیوں کے اثرات بھی بڑھنے لگے۔ چیخوف، ٹالسٹائی اور ترگنیف کے فن سے اردو دنیا آشنا ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں "انگارے" کی اشاعت نے گورکی کے اشتراکی اثرات کو ہوا دی اور ۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک کے

اشتراکی تصوّرات اور جنسی حقیقت نگاری کے تصورات کو زور و شور سے پیش کیا۔ ۱۹۳۴ء میں منٹو نے روسی افسانے شائع کر کے اس تحریک کے لئے مزید بنیاد فراہم کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں افسانے لکھنے والوں کا وہ گروہ پیدا ہوا جو اردو افسانوں کی ریڑھ کی ہڈّی بن گیا۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ سعادت حسن منٹو۔ احمد ندیم قاسمی۔ اختر حسین رائے پوری۔ اختر انصاری۔ خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان میں کرشن چندر کی شخصیت سب سے زیادہ روشن۔ قدآور اور متاثر کُن ہے۔ پریم چند کے بعد اردو افسانے کی یہ دوسری بڑی شخصیت ہے جس نے اردو افسانوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

علم و فن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو افسانوں میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور گھٹن کی نقاب کشائی بھی ہوئی۔ سماج کے تیکھے، گھناؤنے اور سہانے خد و خال بھی اُجاگر کیے گئے اور ذہنی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء تک ترقی پسندی کا زور و شور کم ہو چکا تھا۔ نئے حالات اور ان کے تقاضے سامنے آئے۔ سائنسی اور صنعتی ترقی نے ہندوستانی سماج میں جن پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ فن کے سلسلے میں جو انقلابی خیالات فکر و فن کے سمندر میں موجزن ہوئے اس نے اردو افسانوں میں نئے رجحانات کو جنم دیا۔ اینٹی اسٹوری، علامتی اور تجریدی افسانے وجود میں آئے۔ جوگندر پال، بلراج میرا

سرینڈر پرکاش۔ انتظار حسین۔ اقبال مجید۔ رتن سنگھ اور عباس اطہر نے بلا پلاٹ اور بے کردار تاثراتی افسانے لکھے جو اپنے تاثر کی شدّت کی وجہ سے دِلوں کو جھنجھوڑنے لگے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کے الفاظ میں "اُردو افسانے میں جو نوبہ نو تجربے ہوئے ان میں تازگی۔ گہرائی اور دِلکشی ہے"۔ اُردو افسانوں کے اس مسافرانہ نشیب و فراز نے جہاں مُلک کے دوسرے حصوں کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں نے بھی اس اتصل پتھل سے اثر قبول کیا۔ اور ان اثرات کو افسانوں میں پیش کیا۔

جموں و کشمیر میں اُردو کی اس صنف میں واضح ارتقا نظر آتا ہے یہاں بھی اُردو کی تمام اصناف نے جس طرح ملکی سطح پر ہو رہے ادبی تغیرات کے اثر کو قبول کیا افسانوں میں بھی یہ تازہ لکیریں واضح ہیں۔ پُشکر ناتھ۔ نور شاہ اور موہن یاور نے ہر طرح کے افسانے لکھے اور ان میں اپنے ذہن و فکر کی تازہ پرچھائیاں آ جائیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں پونچھ کا علاقہ وہ واحد علاقہ ہے جہاں اُردو شعر و ادب کی آبیاری آزادی سے پہلے بھی نہایت فراخدلانہ انداز میں ہوتی رہی اور آج بھی اسی وسیع پیمانے پر ہو رہی ہے یہ سرزمین کرشن چندر کا مسکن رہ چکی ہے۔ یہاں کی فضاؤں۔ ماحول سماج اور اشخاص کی مکمل اور جزوی تصویر کشی کرشن چندر کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں میں نظر آتی ہے چراغ حسن حسرت کے بوئے

ہوئے ادبی بیج جو اب مختلف ادیبوں اور شاعروں کی شکل میں تناور درخت بن چکے ہیں آج بھی اپنے فکروفن کے چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اسی علاقے اور اسی ماحول کے پروردہ نئی نسل کے نوجوان ادیبوں میں "خوش دیو" صاحب بھی ہیں۔ جن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "چادر" آپ کے سامنے ہے۔ دوسرے ادیبوں کی طرح خوش دیو نے بھی اردو افسانوں میں کئی تجربے کئے ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے علامتی کہانیاں بھی لکھ کر اپنے ذہن و فکر کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں۔ یہ ان کی ادبی زندگی کا سب سے روشن پہلو ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں دس افسانے ہیں جن میں تین "چاند" "چادر" اور "عرفان" علامتی کہانیاں ہیں۔ باقی عام واقعات پر مبنی سماجی حقیقت نگاری کے پہلودار افسانے ہیں اور ان کہانیوں میں پونچھ کی خوشگوار آب و ہوا اور ناخوشگوار سماجی حقیقتیں ہم آمیز ہو گئی ہیں۔ اس کی بیشتر کہانیوں میں محبت، نفرت، ظلم و جبر اور سماجی اونچ نیچ کے خلاف مصنف کے جذبات شدید معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے جس شدت کے ساتھ سماجی ناہمواریوں کو محسوس کیا ہے اسی شدت کے ساتھ انہیں اپنی کہانیوں میں پیش بھی کر دیا ہے۔

خوش دیو صاحب کا اسلوب نگارش۔ جاندار اور شدت

تاثر کا حامل ہے ان کی رگوں میں جب نوجوان نسل کا خون گرم گردش کر رہا ہے۔ اس کے اچھے نمونے ان افسانوں میں ملیں گے ۔ وہی باغیانہ روش۔ وہی نئی فکر، وہی رسم و رواج کی بندشوں سے آزادی کا ولولہ اور کچھ کر گزرنے کا ذہنی حوصلہ ان کی کہانیوں کے حرف حرف میں موجزن نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ پریم چند اور کرشن چندر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن نئے زمانے کے نئے تقاضوں اور نئی تکنیک سے انہوں نے آنکھیں نہیں چرائیں یہ ان کی روشن ضمیری اور واضح ذہن و فکر کی علامت ہے۔ اگرچہ وہ میدان ادب کے نئے شہسوار ہیں مگر اگر انہوں نے محنت۔ مطالعہ اور غور و فکر کا جذبہ موجزن رکھا تو اُمید ہے کہ وہ جموں و کشمیر کے ممتاز افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام بنا لیں گے۔ ان کے مطالعے میں تنوع معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے پریم چند اور کرشن چندر کے ساتھ ساتھ سریندر پرکاش۔ جوگندر پال اور انتظار حسین کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ان افسانوں میں ان تمام ادیبوں کے فکر و فن کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ ان کے ادبی آنگن میں قدیم و جدید دونوں چراغوں کی روشنی۔ ان کی شخصیت کی وسیع النظری۔ بے تعصبی اور ادبی فراخی کی دلیل ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنی محنت اور لگن سے ایک دن ضرور اپنا مقام حاصل کریں گے۔

(ڈاکٹر) منظر اعظمی جموں

۲۹ جون ۱۹۷۸ء

تعارف

خوشدیو افسانوی دُنیا میں بالکل نووارد ہیں لیکن ان کے سیدھے سادے افسانوں میں زندگی کی صحیح تصویر جھکتی ناچتی اور مچلتی نظر آتی ہے۔

خوشدیو افسانے کے فن، تنوع اور تکنیک سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر وہ اپنے افسانوں پر زیادہ غور و خوض کریں تو ان کے افسانے مزید دلکش اور خوبصورت ہو جائیں گے۔

"چادر" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں دس افسانے شامل ہیں۔

میں افسانوی ادب میں ایک نئے کسان کا استقبال کرتا ہوں جو اپنے خونِ جگر سے اس کھیت کی آبیاری کرنے آ گیا ہے۔

موہن یاور

ترتیب

ہم جوانی کے شجر سے گر پڑے اس طور سے
زرد پتّے جس طرح گرتے ہیں مُرجھائے ہوئے

سیڑھیاں

سیڑھیاں

یہ اُن دنوں کا ذِکر ہے جب میرے سر پہ بال، سینے
میں دِل اور مُنہ میں دانت ابھی سلامت تھے۔ تب عشق اور آٹا
خالص دستیاب تھا، ڈھونڈے پر سچی محبت اور خالص گھی عام طور
سے مِل جایا کرتا تھا۔ اُن دنوں لیڈروں کی تقاریر میں تصنّع اور
اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کا رواج نہیں تھا اور عوام کے چہرے
لکڑی کے بُرادے کی طرح زردی مائل نہیں لگتے تھے۔ اُن دنوں ابھی
زمین کو کیمیائی کھاد کی افیم نے کھوکھلا نہیں کیا تھا، فضا ماحول کی
آلودگی سے پاک تھی اور فطرت انسان کی خوشیوں میں شریک
تھی۔ تب دُھوپ بھی چاندنی محسوس ہوتی اور اپنے ہی پسینے سے
خوشبو آیا کرتی تھی، کیوں کہ وہ دن میری چڑھتی جوانی کے دن تھے۔
نامعلوم اور انجانی خواہشات کی کھوج اور تکمیل کے دن تھے اور خوبصورت
چہروں کے گرد طواف میں آنکھیں مسرت سے ناچ اُٹھتی تھیں۔

اسی لیئے جب توشی ملی تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا
جیسے شرابی کو Vat-69 کی بوتل مل گئی ہو یا کسی مچھیرے کو چمکتی ہوئی
خوبصورت مچھلی۔ توشی کسی مچھلی کی طرح ہی چست، چکنی اور چلبلی لڑکی
تھی۔ اور مچھلی کی مانند ہی اُس کے جسم سے بساند آیا کرتی تھی —
— حالاں کہ وہ کھانا پکاتی اور جھڑکیاں کھاتی تھی اور ایسی لڑکی
کا گندہ اور مغموم ہونا لازمی تھا لیکن توشی نے کبھی بھی کام کا اثر اپنی
چال ڈھال پر پڑنے نہ دیا تھا۔ وہ دن میں دو بار نہاتی اور دس بار
جھوٹ موٹ گنگناتی ہوئی کسی کو آنکھ تو کسی کو چپت مارا کرتی تھی۔
پھر یہ بساند کیسی؟ شاید اُسے بغل گندھ کی بیماری تھی۔ یا یہ بُو
اُس کے مسوڑوں سے آیا کرتی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بساند
اُس کی غربت سے آتی ہو۔
کچھ بھی ہو گندمی رنگ، چھریرے بدن، صراحی دار گردن،
پتلی کمر اور ترچھی نظر والی اس قبول صورت لڑکی نے آتے ہی میرے
گھر اور جگر دونوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے ہی دن اُس نے دُز دیدہ
چمکتی ہوئی گہری اور سیاہ اور شرارت اور بغاوت اور خود سپردگی
کی آنکھوں سے جب مجھے دیکھا تو میں اُن میں چھپے سوالات اور دل
میں اُٹھتے جذبات کو بھلی طرح بھانپ گیا تھا۔
توشی اُس دن مجھے نہایت پُرکشش لگی جب کھانا
کھلاتے ہوئے اپنے ڈھیلے کُرتے سے اُس نے گول اور چکنے پستانوں
کی ایک جھلک یوں دکھائی تھی، جیسے نویلی دُلہن میکے کی سہیلیوں

کو طلائی زیوروں کی ایک جھلک دکھا کر چکا چوند کر دیتی ہے۔ اور تب کنواری سہیلیوں کے دل میں شادی، زیورات اور محبت کی کونپلیں ٹھیک اُسی طرح پھوٹ پڑتی ہیں جیسے اُس وقت میرے دل میں توشی کی قربت اور وصال کے ارمانوں کی کونپلیں پھوٹ پڑی تھیں۔ اُس دن پہلی مرتبہ مجھے توشی کا پکایا ہُوا کدو کا سالن اور بھنڈی کا تِل بہت بھایا تھا۔ اُس دن میں اتنی دیر کھانے کی میز پر بیٹھا نوالے توڑتا رہا اور اس کے چہرے کے حُسن اور غربت کے داغوں سے متعارف ہوتا رہا جتنی دیر وہ موٹی موٹی مست آنکھوں سے میرے اندر جھانکتی رہی۔ اُس وقت وہ کھانا پکانے والی یتیم، بے سہارا اور بے وقوف لڑکی سیب کی اُس ڈالی کی طرح لگ رہی تھی جو پھل کے پک جانے پر اجنبی ہاتھوں کے مس کے لیے خود بخود جھکا کرتی ہے۔

اگلے چند دنوں میں توشی نے رسوئی کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے کام بھی سنبھال لیے تھے جیسے کمرے میں جھاڑو دیتے وقت، بعض اوقات وہ میری پیٹیوں میں بھی جھاڑو دے دیا کرتی تھی جب گھڑی کو چابی لگانے کے بہانے بیڈ روم میں گھستی تو لوہے کے صندوق کو بھی چابی لگا دیا کرتی۔ برتن صاف کرنے بیٹھتی تو میرا دماغ بھی صاف کر جاتی۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن برف گر رہی تھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے آچکا تھا جب وہ نیم برہنہ لباس زیبِ تن کیے

آتشدان سُلگانے میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس بے اعتنائی نے میرے دل کی چنگاریاں بھی سُلگا دی چلی گئی کہ میں تڑپ اُٹھا اور اس گستاخی پہ جھڑکنے کے بجائے میں نے اُسے جامنی رنگ کی ساڑھی خرید دی۔ جسے پہن کر اُس کے حُسن پہ نکھار اور آنکھوں میں خُمار اُتر آیا تھا۔ پھر اگلے ہی دن اُس نے چابیوں کو مٹکا لگاتے ہوئے جب مجھے بھی مٹکا لگا ڈالا، تو میں نے مسکراتے ہوئے گھر کی چابیوں کا گچھا اُس کے حوالے کر دیا۔

اسی لئے پہلی بار جب بھلّہ صاحب میرے ہاں تشریف لائے تو اُنہوں نے توشی کو میری بیوی جان کر بڑی حلیمی سے نمستے کہی تھی۔ جب میں نے انکشاف کیا کہ توشی میری نوکرانی ہے تو بھلّہ صاحب دنگ رہ گئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ اتنی جوان دل لُبھاونی اور تیز لڑکی نوکرانی کیسے ہو سکتی ہے۔ اُن کے ذہن میں نوکرانی کا تصوّر تھا وہ عورت جس کے بال پک چکے ہوں، دانت گر چکے ہوں اور جوانی کے حُسن کو بڑھاپے کی دیمک نے چاٹ کھایا ہو۔

چونکہ بھلّہ صاحب ہماری کمپنی کے جنرل منیجر تھے اور یہاں برانچ آفس کی پڑتال پر ایک دن کے ٹُور پہ آئے تھے جس کا میں انچارج تھا۔ اس لئے وہ میرے مہمان تھے۔ میں اُنہیں یوں بھی خوش رکھنا چاہتا تھا تاکہ جعلی فائیلوں پہ دستخط کرا سکوں اور دھوم سے اپنا واہ واہ رچا سکوں۔ اسی لئے عشائیہ کے وقت میری ہدایت

پر توشی نے بڑے لذیذ کھانے پکائے تھے. کھٹا کھٹا تلبہ اور روغن جوش مزیدار گستابہ اور نمک ناٹھ بھنی ہوئی مچھلی کے کرکرے ٹکڑے، کڑوے اور کسیلے کریلے جن کے چٹخارے لیتے ہوئے سہلہ صاحب نے فرمایا تھا۔

"جعلی فائیلوں پہ دستخط کرنا تو پھانسی کے حکم نامے پہ دستخط کرنے کے مترادف ہے. لیکن تمہارے لیے پھانسی کا پھندا بھی قبول ہے"۔

"یہ آپ کی عنایت اور ذرہ نوازی ہے سر" میں نے تسکین بھرے لہجے میں گنگنیا۔نے ہوئے کہا۔ اب کے توشی مصنوعی بالائی میں بھگوئے ہوئے سٹابری کے لال لال گول گول کھٹے میٹھے دانوں کا ڈونگا بھر لائی تھی. توشی اس وقت چاندی کے سکوں کی طرح شفاف، اُجلی اور کھنکتی ہوئی لگ رہی تھی. تبھی سہلہ صاحب نے پُر اشتیاق نظروں سے سٹابری کے ڈونگے اور توشی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" واہ واہ صاحب مزا آگیا۔ اتنا اچھا کھانا میں نے پہلی بار کھایا ہے. ہم تو آج تک گھاس کھاتے رہے ہیں یہ تو اب معلوم ہوا کہ چیٹ پٹے لذیذ اور لطیف کھانوں کو پکانے اور انہیں پر ذائقہ بنانے میں لطیف اور خوبصورت ہاتھوں کے لمس کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا نام ہے تمہاری نوکرانی کا"؟ سہلا صاحب نے سٹابری کے ڈونگے میں چمچہ ہلاتے اور توشی کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے بڑے

اشتیاق سے دریافت کیا۔

"اسے توشی کہتے ہیں سر، دراصل لڑکی یتیم تھی اور بے سہارا تھی۔ اس لئے در در کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے اور مختلف گھروں میں کھانا پکاتے پکاتے اس فن میں ماہر ہو گئی ہے۔ میں توشی کی تاریخ بتا رہا تھا اور سہگل صاحب اُس کے جغرافیے پر غور کئے جا رہے تھے۔ ادھر توشی بھی سہگل صاحب کو معنی خیز، گرسنہ رعونت شرارت اور محبت بھری اُنہی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی جن نظروں سے اُس نے پہلی بار مجھے دیکھ کر اپنا شکار بنا لیا تھا۔ تلوار میان سے باہر آ چکی تھی۔ کیا شکاری ابھی بھوکا ہے، یہ سوچتے ہی میں لرز گیا تھا اور پورے وجود میں ——— زور کی جھرجھری سی آئی۔ لیکن یہ سوچ کر دل پہ پتھر رکھ لیا کہ ایک ہی رات کی تو بات ہے، کل سہگل صاحب واپس روانہ ہو جائیں گے۔ اس لئے میں نے توشی کی ان نظروں کو نظر انداز کر دیا۔

رات گئے تک دعوت چلتی رہی، رات گئے تک میں اور سہگل صاحب مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے اور لمحہ بہ لمحہ ملکی سیاست، اچھی شراب اور جاذب نظر حسینوں کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ فقط موضوع بدلنے کے لئے گاہے بگاہے توشی کا ذکر چل پڑتا جیسے کہ یہ لڑکی شریر ہے، بانکی ہے، لیکن بے یار و مددگار رہی ہے، اور داغدار رہی ہے۔ جب سہگل صاحب نے فرمایا کہ اُن کا نوکر

منہ زور ہے تو میں نے جواباً کہا کہ میری نوکرانی تھوڑی چور ہے لیکن
اس صفائی اور محتاط انداز میں چیز چُراتی ہے کہ جی چاہتا ہے سب
کچھ اُس کے حوالے کر دوں۔ پھر شیغی بگھارتے ہوئے میں نے کہا کہ
اکثر اوقات توشی میرے پاؤں دباتے ہوئے جب بجلی کا سُوئچ بھی
دبا دیتی ہے تو اندھیرے میں اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے سورج ایک
ہی جست میں ہمک کر زمین کی گود میں آ چھپا ہو۔ دیر تک میں اور بھلّہ
صاحب باتوں میں مشغول رہے اور دیر تک بھلّہ صاحب سگریٹ کے
گُل جھاڑتے اور کسی انجانی شے کو تاڑتے رہے۔

اُدھر توشی کبھی کبھی رسوئی کے دروازے کی اوٹ سے
چھپتی چھپاتی دبی دبی نظروں سے بھلّہ صاحب کو یوں دیکھ لیتی جیسے عام
ہندوستانی عورتیں اجنبی مہمانوں کو دیکھا کرتی ہیں! پھر بھلّہ صاحب تھوڑے
تھوڑے وقفے کے بعد بلغم تھوکنے کے لئے رسوئی کے واش بیسن
کی طرف اُٹھ جاتے جہاں توشی بیٹھی برتن صاف کر رہی تھی۔

اور پھر یوں ہوا کہ دوسرے دن بھلّہ صاحب واپس نہ
جا سکے۔ ایک تو اُن کے گلے میں شدت کا درد اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔
دوسرے دفتر کی ہڑتال سے ابھی وہ پوری طرح مطمئن نہ تھے اور پھر
وہ یہاں فطرت کے گُل ہائے رنگا رنگ سے اتنا متاثر ہوئے تھے
کہ اُنہوں نے اپنا ٹور تین دن اور بڑھا دیا تھا۔

چونکہ بھلّہ صاحب بیمار تھے، اس لئے اُن کا بستر پر لیٹا

رہنا لازمی تھا اور توشی کا اُن کے جسم کو دابنا بھی ضروری تھا اور میرا دفتر جانا بھی لازمی تھا کیوں کہ بھلّہ صاحب کی نظر میں ابھی وہ فائلیں نامکمل تھیں جن پر جانے سے پہلے وہ دستخط کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح اگلے تین دن میں اپنے دفتر میں مصروف رہا، بھلّہ صاحب اپنی بیماری میں اور توشی اُن کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ جب وہ اپنی مصروفیات سے فارغ ہو گئے اور فائیلوں کی درستی سے مطمئن ہو گئے تو تیسرے دن بڑے اطمینان، بھروسے اور حاکمانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اس بات کو ابھی چند ہی روز گذرے تھے کہ مجھے ایک بلائے ناگہانی نے آدبوچا اور آسمان سر پر ٹوٹ پڑا۔ بات یہ تھی کہ توشی میرے ساتھ بیاہ کرنا چاہتی تھی یا ناجائز حاملہ ہو جانے پر دعویٰ کرنا چاہتی تھی۔ سوال اتنا اُس کی عزت کا نہیں تھا جتنا اپنی نوکری کا تھا۔ اگر کورٹ میں ثابت ہو جاتا کہ توشی میرے ناجائز بچے کی ماں ہے تو مجھے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے اور اُسے اپنی شرافت سے۔ اس لئے خیریت اسی میں سمجھی گئی کہ کسی مندر کے منڈپ تلے سر چھپا کے شادی کر لی جائے۔ اس کے لیے رنگشمی نارائن مندر کے پنڈت کو پندرہ روپے دے کر منا بھی لیا تھا کہ وہ پورنماشی کی رات کو دیوتا کو حاضر ناظر جانتے ہوئے مجھے اور توشی کو شادی کے ابدی رشتوں میں باندھ دے گا۔ اور اس بات کو صیغۂ راز میں

رکھے گا۔

پُورنماشی کی رات کو ابھی پندرہ دن باقی تھے اور توشی کو ابھی کپڑے اور گہنے خریدنے تھے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ شادی کے بعد ڈھیروں زیورات اور زیبائش کا سامان بنواتے رہیں گے لیکن اُس نے ایک نہ مانی۔ عورت کی تریاہٹ تو مشہور ہے۔ وہ دھن کی پکی تھی اور شادی کے موقع پر دُلہن کی طرح سجنا چاہتی تھی۔ یوں بھی مجھے توشی سے اب اتنا لگاؤ ضرور ہو چلا تھا جتنا عام آدمی کو اپنے راشن کارڈ سے ہوتا ہے۔ اور آخر وہ میری رفیقۂ حیات بننے والی تھی اس لئے یہ کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑا اور پائی پائی کر کے جوڑی گئی زندگی بھر کی پونجی بینک سے نکلوانی پڑی جس سے توشی کے لئے سونے کے کنگن، جھمکے اور انگوٹھیاں بنوائی گئیں اور چند جاپانی کشمیری اور بنارسی ساڑھیاں بھی خریدی گئیں، جنہیں پا کر وہ اتنا خوش ہوئی کہ اُسی دن اپنی موسی کو بلانے مالیر کوٹلہ چلی گئی تا کہ شادی کی تقریبات میں اُس کی واحد رشتہ دار شرکت کر سکے۔

ایک ہفتہ گذر گیا توشی نہ لوٹی۔ پھر ایک مہینہ نکل گیا۔ لیکن توشی کا اتہ پتہ نہ چلا، پھر ایک سال بیت گیا۔ پر اُس کا کوئی سُراغ نہ لگا۔ اس بیچ میں نے مالیر کوٹلہ کی خاک چھان ڈالی لیکن نہ توشی کی موسی کا گھر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اسی طرح نہ ہی مجھے زیور اور کپڑے واپس ملے اور نہ میرا ناجائز بچہ، وہ تو خیر میں جان چکا تھا کہ توشی نے

مجھے لوٹنے کے لیئے ناجائز بچے کا ڈھونگ رچایا تھا دھیرے دھیرے وقت گذرتا رہا اور دن ، ہفتے ، جیسے زرد پتوں کی طرح میری زندگی کے پیڑ سے جھڑتے رہے۔

اُدھر ہماری کمپنی کو مسلسل مندے کا سامنا ہوا ، اور وہ زبردست خسارے سے دوچار ہوئی۔ جب خسارہ ہوا تو چھانٹی شروع ہوئی اور جب چھانٹی ہوئی تو چند دوسروں کے ساتھ مجھے بھی نوکری سے برخاست ہونا پڑا۔

بنک سے مال پہلے ہی نکلوا چکا تھا اس لیئے بچی کھچی پونجی سے چند ہی ماہ نکل پائے تھے کہ میرا دیوالیہ نکل گیا۔ اُدھر دفتر سے نکلنے کے بعد بہت سے دشمن بھی نکل آئے تھے جو اب جی بھر کے دلوں کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ جب قافیہ بالکل تنگ ہو گیا تو مجبوراً مجھے اس شہر سے بے دست و پا نکل جانا پڑا اور معاش کی تلاش میں راجدھانی جا نکلا۔ جہاں اشوکا ہوٹل میں بیٹلر ہو گیا۔

یہاں مشین کے پُرزے کی طرح دن رات گھومنا پڑتا تھا کام کے بڑھنے سے چہرے کی جھُریاں بڑھ گئی تھیں۔ بدن پہ زردی چھا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی بڑھ گئی تھی۔ اور قوت احساس دن بدن کم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس طرح تو بستی کی یاد فطرت کے خوشنما نظارے دریاؤں کے بے ربط شور ، برانچ آفس کے ان گنت جھمیلے ، ساون کی اُمڈی ہوئی دُھند ، گاڑیوں کی دل نواز چہچہاہٹ ، حسینوں کے ہفت رنگ تبسم اور

دوستوں کے بے مروت چہرے سب ماضی کی اوٹ میں اوجھل ہو گئے تھے یادیں اتنی بڑھیں کہ کچھ بھی یاد نہ رہا، درد اتنا بڑھا کہ درد کی حسیں ہی جل کے راکھ ہو گئیں اور اس طرح میرے سب درد راشو کا ہوٹل کے در و دیوار کے اندر مقید ہو کر رہ گئے۔

اب میں اس ماحول سے مانوس ہو چلا تھا اور کچھ کچھ مطمئن بھی تھا کیوں کہ یہاں مجھے کچھ اپنے مل گئے تھے جو اچھے دوست اور ساتھی بن سکتے تھے۔ ان میں ستار جو بہرا بھی تھا جس کی بیوی بھوک کے عذاب سے مر چکی تھی اور بہن ٹھنڈا ہ بھاگ گئی تھی۔ ٹیبل بوائے کشنا تھا جو ۶۵ سال کی عمر میں بھی کنوارہ تھا اور ہوٹل میں آنے والی بزرگ عورتوں کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ پھر اقبال سنگھ تھا۔ جس کی ٹانگیں لڑائی میں جاتی رہی تھیں اور معذور حالت میں گھر جانے کے بجائے ہوٹل آ گیا تھا وہ سارا دن تندور پر بیٹھا چپاتیاں پکاتا اور جنگ کی ہولناکیاں سناتا رہتا تھا۔ پھر گلو تھا جس کے بال سفید، منہ کالا اور دانت پیلے تھے۔ اور جس کا پیٹ موٹا، ناک چھوٹی اور دل کھوٹا تھا۔ یہ سب میرے ساتھی تھے اور اپنے تھے۔ ہماری دوستیاں بے داغ اور بے لوث تھیں کیوں کہ ہم میں سے کسی کے پاس بھی کسی کو دینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان اپنوں میں رہتے ہوئے خوش تھا۔

پر ایک دن پھر انہونی ہو گئی۔ اور مجھے زندگی کے ایک اور کٹھن مرحلے سے گذرنا پڑا۔

اُس دن اشوکا ہوٹل کے مینیجنگ ڈائریکٹر مہرہ صاحب نے ہوٹل کی سلور جُوبلی کے موقع پہ ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اور شہر کے شرفاء کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ہوٹل ہر طرح سے آراستہ کیا گیا تھا۔ شام ڈھلتے ہی مہمان جوق در جوق آنا شروع ہو گئے تھے حسین جاذب نظر اور خوش رنگ جھومتے جھامتے چہرے مرکزی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ تبھی دُور سے مجھے بھلّہ صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مگر یہ کیا؟ اُن کے ساتھ یہ تو توشی چلی آ رہی تھی۔ جس کے چہرے پہ ہفت رنگ تبسّم بکھرا ہوا تھا۔ اس وقت اُس نے بنفشی رنگ کی وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو میں نے اُسے شادی کے موقع پر لیکر دی تھی اور وہی جُھمکے، وہی کنگن، وہی چہرا، وہی مُسکان، یہ تو واقعی توشی تھی، بے مروت، بے حیا، کٹنی، میرے دل میں طوفان سا اُٹھ رہا تھا اور اس طوفان میں توشی کے ساتھ گذرے ہوئے ماضی کے دن اور واقعات یوں تیر رہے تھے جیسے سمندر کی سطح پہ بادبانی کشتیاں تیرا کرتی ہیں۔ دھیرے دھیرے بھلّہ صاحب اور توشی مرکزی ہال کے اُس کنارے پر پہنچے جہاں مہرہ صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ تبھی بھلّہ صاحب نے مہرہ صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"اِن سے ملیئے یہ سنتوش ہیں میری فرینڈ" اور مہرہ صاحب نے بے ساختگی کے عالم میں سنتوش سے بھی مصافحہ کر لیا۔ اتنے میں بھلّہ

صاحب ایک دوسرے آدمی سے ہم کلام ہو گئے اور اِدھر مہرہ صاحب اور سنتوش (یعنی توشی) محو گفتگو ہو گئے۔ پھر اچانک یہ دیکھ کر میں لرز گیا کہ توشی اس وقت مہرہ صاحب کو، گرسنہ، گہری اور گھمبیر محبت اور رعونت بھری انہیں پُر فریب نظروں سے دیکھے جا رہی تھی، جن نظروں سے اُس نے پہلی بار مجھے اور دُوسری بار سہگل صاحب کو دیکھا تھا۔ یہ تو وہی نظریں تھیں جن میں بے حیائی بھی تھی اور وا سنا بھی۔ اِدھر میں اِس بات سے بھی رُوشناس تھا کہ مہرہ صاحب، سفید جھُوٹ بولنے، کالا دھن جوڑنے اور حسین لڑکیوں کو پھانسنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اُن کی زندگی کے ساحل پہ کئی کشتیاں ٹوٹ چکی تھیں یہ تو اُن کا روز کا معمول تھا۔ اب کے مہرہ صاحب توشی کو کوکا کولا پیش کر رہے تھے اور توشی اُن کی ٹائی کی گرہ ٹھیک کر رہی تھی اور سامنے کھڑے سہگل صاحب، توشی اور مہرہ صاحب کے درمیان کباب میں ہڈی لگ رہے تھے۔

توشی نے آج پھر کینچلی بدلی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر نیا رفیق تلاش کر لیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ میں اور سہگل صاحب، تو سیڑھیاں تھے جن کو عبُور کر کے توشی عشق کی تیسری منزل تک جا پہنچی ہے۔ کیا یہ اُس کی آخری منزل ہے یا ابھی اور سیڑھیاں درکار ہیں؟ لیکن اِس کے بارے میں سیڑھیاں کیا جانیں یہ تو مسافر ہی بتا سکتا ہے کہ اُس کی منزل کہاں ہے۔

سیڑھیاں تو محض سیڑھیاں ہوتی ہیں، جن پہ صرف چلا جاتا ہے چاہا نہیں جاتا۔ جن کی جگہ تو پاؤں میں ہوتی ہے، آنکھوں یا دل میں نہیں۔

توشی آج پھر سیب کے اُس پیڑ کی طرح لگ رہی تھی جس کی پھل سے لدی اور گدرائی ہوئی ڈالیاں ذوق نظر کی تسکین کے لیئے دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ اِدھر میں ایسا درخت تھا جس کے بھری بہار میں سب پتے "جھڑ" چکے ہوں۔ اب میرے اور توشی کے درمیان کسی بھی بات کی مطابقت نہ تھی اس لیئے میں نے اُس کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا۔ اور مرکزی ہال سے کھسکتا ہوا، غلام گردش سے ہوتا ہوا ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے اشو کا ہوٹل سے باہر آ گیا۔ ٭

عرفان

عرفان

چاہا تھا جنہیں وہ میت گئے
خوشیوں کے زمانے بیت گئے
ہم ہار گئے وہ جیت گئے

روت ،

گویا اپنی دُھن میں محبت کا گیت گاتے جا رہا تھا
شاعر کے بول سامعین کے کانوں میں شہد گھول رہے تھے۔ بول جو
دل سے نکل کر دلوں میں اُتر رہے تھے۔ لفظ جو محبت کا اظہار، عشق کا
تحفہ اور دوستی کی علامت تھے جو بے وفائی کی داستان اور ایثار
و قربانی کا ثبوت تھے۔ جو محبوب کا پیکر اُس کے لب و رُخسار، چہرے
کا نُور اور آنکھوں کا سرور تھے، شاعر کے گیتوں میں ڈھل کر سامعین
پر وجد طاری کر رہے تھے۔ سب کی نگاہیں شاعر کی منتظر تھیں لیکن وہ
کہاں تھا ؟

شاعر تو سامعین سے دُور شیدائیوں سے پرے
مرکزی ہال کے عقب میں پت جھڑ کے شجر کی طرح ویران کھڑا تھا۔ اور
پھیکا سپاٹ سگریٹوں کے کش لگائے جا رہا تھا۔ شاعر جس کی زبان اُس
کے جسم کی طرح لرز رہی تھی۔ جس کا جسم اُس کی آنکھوں کی طرح بُجھا ہوا
تھا جس کی آنکھیں اُس کے خیالات کی طرح اُلجھی ہوئی تھیں اور جس کے
خیالات اپنی تخلیق کے حقیقی کردار کو ڈھونڈنے میں مصروف تھے دُور
اندھیرے کی اوٹ میں ایک ستون کا سہارا لیے کھڑا اپنی ہی تخلیقات
پہ مبنی پروگرام سُن رہا تھا۔

لیکن شاعر اس وقت اپنے جسم میں کہاں تھا وہ تو
بیتے ہوئے لمحوں کی سنگلاخ بلندیوں پر کھڑا اپنے محبوب کو پکار رہا
تھا۔ اُس کی نگاہیں تو ماضی کی دُھند سے خوشیوں کے وہ زمانے
ڈھونڈھ رہی تھیں جب پہلی بار اُسے محبوب کا قرب نصیب ہوا تھا اور
دوستی اور رفاقت کے جذبوں سے سرشار اُس نے محبوب کے ہاتھوں میں ہاتھ
ڈال کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا ہاتھ تھا جو صنف
نازک کی مخروطی اُنگلیوں سے مَس ہُوا تھا اور اُسے اپنی انگلیوں کی
پوروں میں مسرّت آمیز اور راحت بخش برقی رو سرایت کرتی ہوئی محسوس
ہوئی تھی، پھر جلد ہی یہ پگھلانے والی گداز کیفیت اُس کے سارے وجود
میں پھیل گئی تھی۔ اور اُس کا شعور، فہم ادراک اُس کے ہوش حواس ایک

عجیب وغریب سم کی مستی سے زبیتر ہو گئے تھے اور اُسے اس طرح لگا تھا جیسے ایک ہی ساعت میں ہزاروں کلیاں چٹخ کر پھول بن گئی ہیں۔ آوارہ ندیوں کو دریاؤں کا قرب اور متلاشی دریاؤں کو سمندروں کا وصل نصیب ہوا ہے۔ جیسے ہزاروں گھنٹے اور شنکھ ایک ساتھ بج اٹھے ہوں اور سُکھ شانتی کے منگل گان گائے جا رہے ہوں اور جیسے قدیم مٹھوں کی دیو داسیوں کی روحیں دو اجنبی ہاتھوں کے پہلے ملاپ پہ پکار اُٹھی ہوں۔ مبارک۔ مبارک۔

شاعر کا ہاتھ محبوب کے ہاتھ میں گھُل رہا تھا اور تسکین بھری رَو اُن کے جسموں میں کُنمنا رہی تھی۔ ذہن عجیب و غریب سرور اور خوشبو سے معطر تھا۔ ہر طرف شانتی سکون اور محبت کی ہوا چل رہی تھی کیا یہی نروان ہے۔ یہ سوچتے ہی شاعر کو زندگی کا حاصل محبت کی تکمیل میں نظر آیا تھا۔

شاعر نے اس وقت محبوب کے ہاتھوں کے لمس کو اپنے ہاتھوں میں محسوس کیا اور سوچا کہ کاش یہ ہاتھ اُس نے کبھی نہ دیکھا ہوتا کہیں نہ چھُوا ہوتا، لمس کی بھینی بھینی کیفیت کو سنبھال کے رکھا ہوتا کہ ان ہاتھوں کو محبوب کے ہاتھوں کے وصل کا فیضان حاصل ہوا تھا۔

مرکزی ہال تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور داد کی گھن گرج سے گونج رہا تھا۔ شاعر کی نظمیں سامعین کے دلوں میں جادو جگا رہی تھیں اس وقت گویا شاعر کے ایک مشہور گیت کے اس شعر کو بہروں کا لباس پہنا رہا تھا۔

جب باغ میں کوئل بولے گی
کانوں میں مدھر رس گھولے گی (دت)

گوتیے کی آواز دُور کھڑے شاعر کے کانوں میں
...کی ٹاپ کی طرح گونج رہی تھی۔ تبھی شاعر آواز کے اس گھوڑے
پہ سوار ہوگیا اور اُس باغ میں جا پہنچا جہاں کوئل اور پپیہے بول رہے
تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے خنک جھونکے بدن کے بوسے لے رہے
تھے۔ یہاں چنار اور سرو کے سربلند درختوں تلے شاعر اور اس کے
محبوب نے ایک دن محبت اور وفا اور دوستی کے وعدے کیے تھے
اُس روز سورج افق کو گلنار بناتا ہوا اُن کی خوشیوں میں شریک
ہوا تھا۔ پھولوں پہ منڈلاتے ہوئے بھنوروں نے بھوں بھوں کر کے
ہستی کے نقارے بجائے تھے۔ چمیلی کے سبز پتوں نے سر بسجدہ
اُنہیں خوش آمدید کہا تھا اور طوطے رنگ گھاس نے شاعر اور اُس
کے رفیق کو اپنی نرم دوب پر بیٹھنے کی ترغیب دی تھی۔ اور وہ
گھاس کے مخملی قالین پہ بیٹھے ہوئے پُرسکون انداز میں ایک دوسرے
کو دیکھے جا رہے تھے۔ تب خاموشی گھونٹ گھونٹ اُن کے حلق سے
اُتر رہی تھی محبت بوند بوند اُن کے دلوں میں ٹپک رہی تھی اور عشق
قطرہ قطرہ اُنکے بدن میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ تب آنکھوں ہی آنکھوں
میں دونوں نے ساتھ دینے اور ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور سوچ

دیا تھا کہ اب وہ ایک ساتھ سوچا کریں گے اور اپنی ہر خوشی اور غم رات اور دن، ذہن اور دل کو ایک دوسرے کی رفاقت، کشش اور قربت سے سرشار رکھیں گے۔ وہ خاموش تھے اور پُرسکون تھے اور باتیں کئے بغیر بھی محو گفتگو تھے وہ اب رُوپ اور اروپ لفظ اور نا لفظ دونوں صورتوں میں ہم کلام تھے اُس وقت اُن دونوں کو یہ احساس ہو چلا تھا، کہ وہ ایک دوسرے کے وجود میں شامل ہیں اسی لئے اب اُن کے دو جسموں کے ایک ہو جانے کے احساس نے بھی اپنی کشش کھو دی تھی کیوں کہ محبت نے دوئی کو ختم کر دیا تھا اور وہ ایک ہو چکے تھے تب شاعر اس حقیقت سے روشناس ہوا تھا کہ محبت ہی اصل حقیقت ہے۔ زندگی کا حاصل اور تسکین کا مرکز محبت ہے۔

اب طبل کی تھاپ بدل چکی تھی۔ سُروں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ گویّے کی آواز سراسیمگی میں ڈوب رہی تھی اور گیت کے بول مایوسی کے نمک میں گھُل رہے تھے۔

لوگ کرتے ہیں عہدِ وفا ٹھیک ہے
کتنے ہوتے ہیں وعدے وفا سوچ تو
کیسے ہوتے ہیں عاشق جُدا سوچ تو

یہ بول سُنتے ہی شاعر کے ذہن میں جُدائی کے وہ لمحے عود کر آئے جب محبت قانون، سماج اور مذہب سے سند حاصل

کرنے کے لئے منظرِ عام پہ آئی تو اُس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ذات برادری، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کے تفرقوں نے دو کھلتے ہوئے پھولوں کو جھلس کر رکھ دیا۔ اب شاعر اور اُس کے رفیق کے درمیان فقط نیت ہی نہ تھی بلکہ وقار اور دولت اور جاہ و حشمت کی دیواریں بھی حائل ہو چکی تھیں اور جدائی اور فرقت کے پہاڑ بدلتی ہوئی ساعتوں کے ساتھ ہی ساتھ بلند سے بلند تر ہوتے چلے گئے تھے۔

یہ سوچتے ہی شاعر کے چہرے پہ غمگینی نے ویرانی کا سایہ ڈال دیا تھا۔ اُس کی شریانوں کے خون میں سُرعت اور سُبک رفتاری آچکی تھی۔ نسیں پھول رہی تھیں اور جسم کی لرزشیں شدت اختیار کر گئی تھیں اور شاعر کو اپنے سینے میں بلوری کرچیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

تبھی مرکزی ہال سے گونجتی ہوئی گویّیے کی آواز نے شاعر کے خیالات کو نئی سمت عطا کی اور وہ ماضی کی چٹان سے ٹکرا کر چابک کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح واپس پلٹ کر اپنے جسم میں داخل ہو گیا۔ اُدھر مرکزی ہال میں شاعر کا یہ گیت ہوا کے دوش پہ رقص کر رہا تھا۔

ہم کو جینا ہے اس دہر میں دور ہیں،
اس سے کٹ کر جئیں گے تو مر جائیں گے

آؤ ضد چھوڑ دو زخم بھر جائیں گے

پر زخم تو آج بھی ہرے تھے۔ ٹیس تو اب بھی اُٹھ رہی تھی۔ اور درد تو جلتی ہوئی گیلی لکڑیوں کی طرح مسلسل سُلگ رہا تھا۔ لیکن شاعر کے لئے یہ زخم محبوب کا تحفہ تھے وہ ان زخموں کی ہی تپش سے زندگی کی توانائی حاصل کر رہا تھا۔ اب تو وہ اس کرب اور اذیت سے مانوس ہو چلا تھا اور جب اُسے اپنی محبت دو جسموں کے ملاپ کے بجائے تیاگ کرنے اور اذیت سہنے میں نظر آئی تو محبت محبوب کے وجود سے نکل کر کائنات کے ذرّے ذرّے میں پھیل گئی اور خود شاعر ریزہ ریزہ ہو کر ہر ذرّے میں شامل ہو گیا۔ اس طرح اب اُس کا پیار معشوق کے دل میں دھڑکنے کے بجائے ہر دل میں دھڑکنے لگ پڑا تھا۔ اب سوال یہ نہیں تھا کہ کون کس کو قبول کیا اور کس نے کس کو دھوکا دیا۔ سوال یہ بھی ختم ہو چکا تھا کہ اُس کی محبت جو ریاضت اور عبادت کی منزلیں طے کر چکی تھی، کا انجام کیا ہوگا بلکہ سوال تو یہ تھا کہ شاعر نے اس محبت سے گیان حاصل کر لیا تھا۔ اور عشقِ مجازی نے زندگی کی اصل حقیقت کو اُس پہ آشکارا کر دیا تھا اور وہ اُس منزل پہ پہنچ چکا تھا جہاں ہر دُکھ میں سُکھ تھا۔ ہر رنج میں راحت تھی۔ اور ہر کوفت میں مسرت تھی۔ اس لئے کہ اُس کے چار سُو محبت ہی محبت تھی۔

اُسے یاد آیا ابھی کچھ دیر پہلے اُس کا ادیب دوست
اُس پہ ترس کھا کے اُسے انتقام کا درس دے رہا تھا لیکن وہ ادیب
کیا جانے کہ کون کس پر ترس کھا رہا ہے۔ اے نازاں دوست یہ
بھی ممکن ہے کہ مجھے ہی تم پر رحم آ رہا ہو شاعر نے سوچا۔ کیوں کہ تم
جو انتقام اور عمل کی راہوں پہ گامزن ہو محبت کی حقیقت سے بے
بہرہ ہو۔ تم کیا جانو کہ اِس اذیت اور کرب میں کتنا قرار ہے۔ آنند ہے
سرور ہے تم نہیں جان سکتے کیوں کہ تم وہ ہو جنہوں نے محبت کے
محلوں کو آگ لگا کے تماشا دیکھنا سیکھا ہے۔

اُس ادیب نے شاعر کو پسپائی اور فرار کا طعنہ دیتے
ہوئے کہا تھا کہ شاعر نے اپنی زندگی کی کشتی کے سارے چپّو سمندر
میں پھینک دیئے ہیں۔ شاعر نے سوچا کوئی اُس خبطی ادیب سے پوچھے
کہ یہاں کون ہے جس نے زندگی کی بندرگاہ دیکھی ہے یا جو کنارے
پہ اُترا ہے یہاں تو سبھی وقت کے سمندر میں ہچکولے کھا رہے ہیں
اور حالات کے تھپیڑوں کے فیصلے سہتے چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے
اے بے وقوف دوست سُن کہ میں نے اپنا جسم حالات اور ماحول
کے سپرد کر دیا ہے۔ اور خود تماشائی بن کر دُور جا کھڑا ہُوا ہوں میرے
لیے اب دُنیا کی کسی بھی شئے میں کشش نہیں کیوں کہ ہر شئے کے
بدلے میں نے محبت لے لی ہے اور محبت لے کر میں نے دُنیا

کی ساری خوشیاں ساری خوشبو اور سارا حُسن حاصل کر لیا ہے۔ اب
میں کس چیز کی تمنا کروں اور کیوں کروں۔ اب تو یہی تمنا ہے کہ کوئی تمنا
ہی نہ کی جائے۔ کیونکہ یہاں تو ہر شے فانی ہے فنا ہے تغیر پذیر ہے
لیکن محبت اٹل ہے، امر ہے، امٹ ہے اس احساس سے روشناس
ہونے کے بعد شاعر کو کھانے چھونے اور دیکھنے کی لذتوں سے اکتاہٹ
ہو چلی تھی اور اُس نے اپنی ہر حسرت پر، ہر تمنا پر اور ہر خواہش پر محبت
لکھ دیا تھا۔ اور زندگی کی ہر شئے سے بے نیاز ہو کر شاعری کا جامہ پہن
لیا تھا اور محبت کے گیت لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ
شاعری کی بساط سُروں پر بچھی ہے اور سُر ابدی ہیں۔ اسی طرح جب
تک سُر رہیں گے اُس کی شاعری رہے گی۔ جب تک شاعری رہے
گی اُس کی محبت زندہ رہے گی، اور جب تک اُس کی محبت کے
گیت زندہ رہیں گے وہ خود دوسروں کی زبان پر رقص کرتا رہے گا
اس طرح شاعر نے خود کو فنا ہونے سے بچا لیا تھا۔

اب مرکزی ہال میں پروگرام اختتام پذیر تھا۔ سامعین
نے شاعر کے تخیل پرداز اور شعروں کے حسن کا لوہا مان لیا تھا۔
نقادوں نے اُسے دورِ حاضر کا بہترین نظم نگار کہا تھا۔ اور اُس کی
حوصلہ افزائی اور ادبی کاوشوں کے اعتراف کے طور پر شاعر کو بہت
بڑے انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔ لوگوں کی نظروں میں اُس کی عزت

ارتقا کی بلندیوں کو چھو رہی تھی اور وہ اتنے بڑے فنکار کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب تھے۔ مائیک پہ بار بار اُس کا نام پکارا جا رہا تھا تاکہ وہ انعام و اکرام سے نوازا جا سکے۔

لیکن شاعر دُور اندھیرے کی اوٹ میں کھڑا مسکرا رہا تھا وہ سوچنے لگا اُس سے محبت چھین کر عزت دی جا رہی ہے تاکہ وہ ان بیساکھیوں کے سہارے کچھ دیر اور تڑپ سکے پر اُس کی نظروں میں اس انعام و اکرام اور قدر و منزلت کی کوئی وقعت نہ تھی اُس کے لئے تو تعریفیں اور صلے اپنی کشش کھو چکے تھے، اب وہ لفظ اور معنی کی پرکھ میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اُس نے محبت کا سامنا کیا تھا۔ اِس لئے محبت کے سوائے دنیا کی ہر شئے اُسے ہیچ اور حقیر لگ رہی تھی پھر یک لخت اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ زمان و مکان سے اوپر اُٹھ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ موجود تھا، موجود ہے اور موجود رہے گا۔ کیوں کہ وہ سراپا محبت ہے یہ سوچتے ہی اُسے سکون، راحت اور ٹھنڈک محسوس ہوئی اور اُس کے ذہن کے پردوں پر شاکیہ منی کے یہ الفاظ گُونج گئے کہ اُن لوگوں کو ریاضت مبارک جنہیں شانتی میسر آگئی ہے۔ اس طرح شاعر نے اسی جذبے سے متاثر ہو کر سامعین سے داد و تحسین حاصل کرنے کے بجائے اندھیرے کے سمندر میں

چھلانگ لگادی اور وقت کی آنکھ سے اوجھل ہو گیا ⁂

پہلا پتھر

پہلا پتھر

اُس وقت جلوس بالکل پُرامن چل رہا تھا۔ لیکن جب
میں نے پہلا پتھر مارا تو دونوں اطراف کی بھیڑ یُوں بھڑک اُٹھی تھی،
جیسے کسی نے پٹرول کے برتن پر ماچس جلا کے پھینک دی ہو
آن واحد میں پتھروں اینٹوں اور سوڈا واٹر کی بوتلوں کی بوچھاڑ
شروع ہو گئی۔

اُدھر پہلا پتھر داغنے کے بعد میں بھیڑ سے نکل کر اُس
چوبارے پر جا چڑھا تھا جہاں سے پُورے شہر کا منظر میری نظروں
کی جست میں تھا۔ میرے بھیڑ سے کھسک کر یہاں آنے تک لوگ
لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور تلواریں لے کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے
سکتے ہیں یہاں سے بڑے آرام کے ساتھ سیگرٹوں کے مرغولوں کو

ہوا میں تحلیل کرتے ہوئے کٹتے ہوئے سر، ٹوٹتے ہوئے بازو، روتی ہوئی آنکھیں، سہما گئے ہوئے چہرے اور لٹتی ہوئی دوکانوں کا منظر دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد شہر فوج کے حوالے ہو گیا تھا اور ڈھنڈورچی، لاؤڈ سپیکروں پر لوگوں کو اپنے اپنے گھر چلے جانے کی تلقین کر رہے تھے ادھر لوٹتی ہوئی بھیڑ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ چکی تھی اور شہر کے نواحی علاقوں اور گلی کوچوں میں داخل ہو چکی تھی جہاں یہ بھیڑ ایک دوسرے کے گھروں کو لوٹنے اور آگ لگانے میں مشغول تھی

اب میں چوبارے سے اُتر کر شہر کی اُس معزز ہستی کے گھر جا گھسا تھا جس نے مجھے، بھیڑ کو اشتعال دلانے اور پہلا پتھر مارنے کے عوض پانچ سو روپے دینے کئے تھے۔ پانچ سو کے نوٹ جیب میں اُڑس کر میں سیدھا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں جگہ جگہ بلوائیوں کے گروہ ملے جو لوٹ مار اور آتش زدگی کی وارداتوں میں ملوث تھے

لیکن آج میں بہت خوش تھا کیوں کہ اِس آگ اور خون کے معرکے میں زندہ سلامت بچ نکلا تھا اور اوپر سے پانچ سو روپے کے نوٹوں سے میری جیب بھری ہوئی تھی۔

یہ سوچتے سوچتے میں اپنی گلی میں داخل ہو گیا۔ لیکن
نکڑ سے گذرا ہی تھا کہ ٹھٹک کے رہ گیا میری حویلی سے اُٹھتے
ہوئے آگ کے شعلے آسمان کے ساتھ باتیں کر رہے تھے اور
گھر والوں کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ اچانک مجھے اس بات
کا شدید احساس ہوا کہ کہیں یہ میرے پہلے پتھر کا نتیجہ تو نہیں۔

چاند

چاند

آج چودھویں کی رات ہے۔ پورنماشی کی رات
پورے چاند کی رات جب چاند زمین کی چھت پہ آب وتاب سے
چمکتا ہے۔ گاؤں گاؤں شہر شہر دودھیا چاندنی برستی ہے۔
ساگروں میں جوار بھاٹا آتا ہے اور کوئی انجانی چیز سمندر کو چیر
کر مدوجزر میں ڈھل جاتی ہے۔ گہرے پانیوں میں ارتعاش
پیدا ہوتا ہے کروڑوں موجیں بیک وقت متحرک ہو جاتی ہیں۔ سیپیاں
گھونگھے اور مچھلیاں تھرتھرانے لگتی ہیں اور سمندر چاند کی رفاقت
کو پانے کے لئے آسمان کی طرف ہمکتا ہے۔

آج یہی مدوجزر اُس کے اندر پھیل رہا ہے لیکن
اُس کے ذہن کا سمندر سوکھ چکا ہے۔ اور وہ کسی انجانی کشش
کی بدولت چاند کی تلاش میں چل رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ

جسم کے اُس حصے کی تلاش میں نکلا ہو جسے چاند نے بھُولپن میں
اُس سے چُرا لیا تھا۔ آج اُس کے سوا اُس کے ساتھ کوئی بھی نہیں
وہ بھی شاید اس لئے اپنے ساتھ چل رہا ہے کہ اپنے وجود میں قید
ہے۔ ورنہ بادلوں بھری اس اندھیری اور طوفانی رات میں کون باہر
نکلتا ہے۔ منزلِ انجانی۔ مسافر بھولا اور نتیجے سے بے نیاز۔ اُسے یہ
بھی خبر نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ بس چاند کی
دُھن اُسے مشرق کے اُن اُلجھے ہوئے پہاڑی سلسلوں کی طرف
کھینچے لئے جا رہی ہے جہاں سے چاند طلوع ہوا کرتا ہے اور لمحہ
بہ لمحہ سوچوں کی زمین پہ لڑھکتا جا رہا ہے اور قطرہ قطرہ خیالات میں
گر رہا ہے۔ پانے کی آرزو اپنانے کی جستجو کسی کو اپنی تحویل میں
لے لینے کی زبردست خواہش نے اُس کے پاؤں تلے سے زمین
کھینچ لی ہے اور اب وہ صرف خیالات کے سہارے پہ چل رہا ہے تاکہ
وہ چاند تک پہنچ سکے۔ اُسے دیکھ سکے لیکن چاند تو بادلوں میں گم
ہے۔ نہ جانے پھر بھی وہ کیوں مشرق کے پہاڑی سلسلوں کی سمت رواں دواں ہے
بچپن سے ہی چاند اُسے چاہتا، اُس سے کھیلتا
اور اُس کے آنگن میں جھانک کر دعوتِ نظارہ دیا کرتا تھا۔
جب وہ گھٹنوں کے بل چلنے لگا تھا تو چاند اُس کے ننھے منے
ہاتھوں پہ اپنی کرنیں چمکاتا۔ آنکھوں میں لرزتا اور ماتھے پہ بکھر جاتا۔

کرتا تھا دُوج کا معصوم چاند جو اُسی کی طرح مُنا اور متین تھا، کئی بار اُس سے بغل گیر ہوا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن تب وہ دوستی اور خلوص کے جذبوں سے ناآشنا تھا۔ اِسی لیئے وہ بچپن میں چاند کی رفاقت حاصل نہ کر سکا۔

لڑکپن کے زمانے میں بھی چاند اُس پہ فریفتہ تھا وہ راتوں کی تنہائیوں میں کھڑکی کے سوراخوں سے چھن کے اُس تک پہنچتا اُس کی آنکھوں کو چومتا۔ ماتھے کو چھوتا، گالوں کو اپنی کرنوں کی کومل پلکوں سے تھپتھپاتا اور چاندنی کی ریشمی ڈوریاں جھلملاتا ہوا اُسے اپنائیت کی دعوت دیتا لیکن اُن دِنوں وہ موسموں کی گھلاوٹ سے سرشار غنودگی اوڑھ کر لیٹا ہوتا تھا اور رات اُس کی پلکوں پہ سوئی ہوتی تھی اسی لیئے وہ چاندنی کی طرف کروٹ کر لیا کرتا تھا۔ لیکن چاندنی رات رات اُس کے بستر پہ تڑپتی مچلتی اور تلملاتی رہتی تھی۔

چاند نے اُسے اُن دنوں بھی اپنانا چاہا تھا جب وہ محوِ سفر تھا اور سنگلاخ گھاٹیوں اور بے چراغ راستوں پہ چلتے ہوئے رات نے اُسے آلیا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ اندھیروں کے لشکر سے ہار مان لیتا لیکن یہ مہتاب ہی تھا جس نے رات کے کالے طوفان میں اُس کے حوصلے بڑھائے تھے اور اُمید کی کرن بن کے پہاڑوں کی کوکھ سے دھیرے دھیرے باہر نکلا تھا۔ اور آہستہ

آہستہ چاندنی پہاڑی چوٹیوں سے نیچے اُتری تھی اور کرنیں تاریکیوں کو چھانٹتی ہوئی اُس کی راہوں میں روشنی کی تہیں بچھاتی چلی گئی تھیں اور وہ روشنی کی چادر پہ چلتا ہوا منزل تک جا پہنچا تھا۔ اُن دنوں تب بھی چاند اُس کے ساتھ چلا تھا جب وہ خود بھی خود سے کوسوں دُور ہوا کرتا تھا لیکن کبھی بھی اُس نے چاند کی دوستی، مروت اور محبت کو محسوس نہ کیا تھا۔ اُس نے کبھی نہ سوچا کہ چاند سورج کی آتشیں کرنوں کو نگھلا کر اُن کا تلخ اور ترش سیال خود پی لیتا ہے۔ اور ٹھنڈی، معتدل اور مرطوب روپیلی چاندنی اُس تک روانہ کرتا ہے تاکہ اُسے راحت نصیب ہو۔ اُسے اس بات کا کبھی احساس نہ ہوا کہ اگر چاند اُس کی راتوں سے ہٹ جائے تو اُس کی زندگی کتنی اجڑی اور ویران ہو جائے گی۔ اس طرح بے خیالی میں جب ہر بار وہ چاند کو ٹھکراتا رہا اُسے نظر انداز کرتا رہا تو ایک دن وہ آیا کہ چاند نے خود اُسے ٹھکرا دیا، رد کر دیا۔ اپنی محبت کے کنول لوٹا لیے۔ اور توجہ کے اُنیوں کا رُخ تبدیل کر دیا۔ اس طرح وہ چاند کے لیے اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اور اُس کے وسیع و عریض آسمان پہ بادل چھا گئے گھنگھور گھٹائیں زلفیں بکھرائے ہوئے ہواؤں کی زمینوں پر پھنکارنے لگیں دھند نے اپنے پٹارے سے روئی اڑانی شروع کر دی اور چاند چھپ گیا اور اُس کی راتیں اندھیری ہو گئیں۔

اس طرح جب اُس کے گھر کی دیواروں پہ آسیب آ جمے۔ طلسمی سکوت نے ڈیرے ڈال دیئے اور خوفناک تنہائی کا سانپ اُس کے احساس کو ڈسنے لگا تو اُسے چاند یاد آیا (برستی ہوئی چاندنی کی پھوار میں ناچتی ہوئی چکوری کے گیت یاد آئے) چاند کی دوستی، رواداری اور اُس کی راہوں میں بچھ جانے کی خصلت یاد آئی، جو اُس کی شاہراہوں اور پگڈنڈیوں کو چومتی ہوئی کسی عربی کنیز کی مانند خاموش، پُرسکون اور لبھا دینے والے انداز میں جھکتے جھکتے اُس کی راتوں کے دروازے پہ دستک دیا کرتی تھیں تو چاروں طرف رنگ ہی رنگ پھیل جایا کرتے تھے۔

آج چاند اُس کی یادوں میں تھا دل میں تھا گھٹتا اور بڑھتا قرمزی چاند اُس کی نس نس میں سرایت کر چکا تھا آج وہ چاند کے جلوے کا منتظر تھا۔ متلاشی تھا متمنی تھا اُس کی دودھیا کرنوں کو یوں اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا تھا جیسے ساحل کی ریت سمندر کی موجوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ بادلوں بھری کالی اور ڈراؤنی رات میں اُسے چاند کی روپہلی ملگجی اور قرمزی چاندنی کی جستجو تھی جس کے برسنے سے اُس کے دل کی جھیل میں رنگوں خوشبوؤں اور دھنوں کا آبشار گرنے لگتا تھا۔

آج اُسے اُن محبتوں کا رنج تھا جو وہ چاند سے نہ کر

سکا۔ یہ سوچتے ہی جب اُسے احساس ہوا کہ وہ زندگی بھر غفلت کی چٹان پہ بیٹھا کھُردرے ریگ مار لیئے اپنے بدن سے دوستی کی تہوں کو کھُرچتا رہا تھا تو وہ ندامت اور پشیمانی کے نمک میں گھُلنے لگا۔ اور اُسے اُن لمحوں کی تلاش ہوئی جن میں اُس نے محبوب کی دوستی کو ٹھکرایا تھا جن لمحے تو دریائی لہروں کی طرح تبدیل ہو چکے تھے۔ دوستی کا کھیل تو کھیلا جا چکا تھا اور وقت کے ہاتھوں نے دوستی کی بساط سے مان کے مہرے اُٹھا لیئے تھے اور ماضی کی راہوں پر ساعتوں کے درخت سے اتنے پتے جھڑ چکے تھے کہ اُسے اپنے قدموں کے نشان نہیں مل رہے تھے۔ وہ چاند تک رسائی کے تمام راستے بھُول چکا تھا۔

لیکن پھر بھی وہ چل رہا تھا۔ پورب کی اور رواں دواں تھا۔ کیوں کہ آج چودھویں کی رات تھی اور اُسے پورے چاند کی آرزو درتمنا تھی۔ اُسے کامل یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے بادل کی چادر پھاڑ کر چاند ضرور جلوہ گر ہوگا اور اُس کی راتیں چمک اُٹھیں گی۔

وہ چلتا گیا، جنگلوں، جزیروں، ڈھلوانوں۔ پہاڑوں، اندھیروں، آندھیوں اور بگولوں سے ہوتا ہوا مشرق کی اُس چوٹی کی طرف گامزن رہا جس کی اوٹ سے چاند طلوع ہوا کرتا تھا۔

پر بادل چھٹنے تھے نہ چھٹے اور کالی رات بجلیوں کے کھنگھرو چھنکاتی ہوئی جنگل جنگل ناچتی رہی، بادلوں کے دھماکوں سے

اُونچے پہاڑ لرزتے رہے۔ گلیشیر چوٹیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے

اور طوفان جھکڑوں کے ڈھول بجاتے ہوئے بستی بستی گونجتے رہے

لیکن وہ اپنے ارادے سے متزلزل نہ ہوا اور بدستور چلتا رہا۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ رات بھر وہ محوِ سفر رہا،

اور حالات سے جوجھتا رہا ہے، محبت، روشنی اور لمس کی آرزو اُس

کی اُمید کے قدموں کو توانائی دیتی رہی، من باتی اور کرم چاند کی کشش

کو کھینچتے رہے۔

آخر جب جسم اپنی کھال میں چرمرانے لگا اور ہڈیاں

گوشت کے غلافوں میں چٹخنے لگیں تو وہ ہار کر زمین کی سطح پر کھڑا

ہو گیا۔ زمین جو اُس کی ماں تھی۔ آسمان جو اُس کا باپ تھا۔ چاند جو

اُس کا محبوب تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اِس وقت محسوس کر رہا تھا

کہ وہ اِن تینوں سے دُور ہوتا جا رہا ہے وہ دیر تک چاند کا انتظار

کرتا رہا اُسے بلاتا رہا، تڑپتا رہا، بلکتا رہا لیکن چاند تو اُسے بھول

چکا تھا در گذر کر چکا تھا وہ تو اِس وقت بادلوں کے ہنڈولے

میں جھول رہا تھا۔ جب چاند نے اُس کی ہر آواز کو ٹھکرا دیا تو اُسے

اِس بات کا شدید احساس ہوا کہ ایک بار بچھڑ کے وصال ناممکن ہے۔

اور پھر یوں ہُوا کہ انتظار کے پاؤں تھک گئے اور

وہ نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اب اُسے کوئی تمنا نہ تھی۔ وہ کامل

سکوں کی خاطر سو جانا چاہتا تھا۔ اب وہ نجات چاہتا تھا، رنج سے
راحت سے، سونے سے جاگنے سے، اپنوں سے اپنے سے،
اس وقت وہ اپنے ہونے اور نہ ہونے کے بیچ کھڑا تھا۔ تب
یک لخت اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا وجود برف کے گالوں کی طرح پگھل
رہا ہے وہ تبدیل ہو رہا ہے۔ لمحوں کی تحویل سے آزاد ہو رہا ہے۔
چاند کی طرف ہمک رہا ہے۔

دوسرے دن جب روشنی نمودار ہوئی تو اُس کی لاش
شہر کی مشہور رقاصہ "چاند" کے بنگلے کے باہر پڑی ہوئی ملی۔
یہ بنگلہ شہر کے مشرقی پہاڑی سلسلوں کے دامن میں واقع ہے۔
پولیس کی تفتیش پہ معلوم ہوا کہ اس شخص کو سوتے میں چلنے کی بیماری
تھی اور پچھلی رات کی شدید آندھی، جھکڑ اور بادلوں میں گِر کر جاں بحق
ہو گیا تھا۔

نجات

نجات

میں دفتر میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا چائے کی
چسکیاں لے رہا تھا اور ٹیبل پر پڑے پیپر سے کھیل رہا تھا، کہ
چپراسی نے روز کی ڈاک کے لفافے میری ٹیبل پر لا رکھے۔
ابھی پہلا لفافہ ہی کھولا تھا کہ میں اچھل پڑا، اور چائے
کا گھونٹ میرے گلے سے واپس لوٹ آیا تھا۔
اس لفافے میں میری تبدیلی کا حکم تھا اور مجھے دو دن کے
اندر اندر سری نگر کے بڑے دفتر میں حاضر ہونے کو کہا گیا تھا۔
پچھلے سات سال سے میں اس شہر میں تعینات تھا
اور میری جوانی کے سنہری اور رنگین دن یہاں ہی گزرے تھے یہاں

میرے دوست و احباب تھے اور یہاں ہی میرے محبت کے جذبوں سے سرشار وہ رشتے تھے جن کے سہارے انسان اپنا جیون گذار دیتا ہے۔ اسی لئے تبدیلی کا آرڈر پڑھتے ہوئے مجھے اس طرح محسوس ہوا تھا جیسے کسی پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا گیا ہو۔

مَیں کسی صورت میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا اور اس اندھیرے میں مجھے ایک ہی روشنی کی کرن نظر آ رہی تھی اور وہ تھے میرے لنگوٹیئے یار مسٹر شرما صاحب، اُن کا خیال آتے ہی میری ڈھارس بندھی تھی کیوں کہ وہ بڑی اپروچ والے آدمی تھے ایک تو ٹھہرے مانے ہوئے ٹھیکیدار اوپر سے سیاست میں اُن کا بڑا دخل تھا اور حزب اقتدار کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کی بدولت کابینہ کے وزراء تک اُن کی رسائی تھی، مجھے پورا یقین تھا کہ شرما صاحب میری جُدائی کو کبھی گوارہ نہیں کریں گے اور میری تبدیلی کا یہ حکم منسوخ کرا دینگے۔ اسی لئے جلدی جلدی مَیں نے ٹیلی فون پہ شرما صاحب کا نمبر ملایا، خوش قسمتی سے وہ ٹیلی فون پر موجود تھے مَیں نے انہیں اپنے پاس بُلا لیا تاکہ تفصیل سے بات ہو سکے اور چند منٹوں میں شرما صاحب میرے دفتر آن پہنچے تھے۔

"کہو بھائی خیریت تو ہے نا"؟ وہ میرے سامنے والی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"ایک خبر ہے یار" میں نے بات بڑھا لی۔

"کچھ کہو تو پتہ چلے نا" ؟

"میری تبادلی ہو گئی ہے" میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی ہنسی بکھیرتے ہوئے کہا۔

"کہاں" ؟

"سری نگر"

"اچھا تو ایک بات کرتا یار جاتی بار اپنا کوارٹر مجھے دیتے جانا۔ وہ ہمارے ڈی صاحب ہیں نا پچھلے ایک ماہ سے اچھے مکان کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور تمہارے والا یہ خوبصورت کوارٹر انہیں دلا کر میں اُن کا دل جیت لوں گا۔ اور تم تو جانتے ہی ہو کہ ٹھیکیداری کے سلسلے میں اُن سے روز ہی منہ لگتا ہے۔ ہاں تو کب جا رہے ہو تم ؟ یہ کہتے ہی وہ ٹیلی فون پر ڈی صاحب کا نمبر ملانے لگ پڑے اور میں کچھ پھٹی پھٹی نظروں سے اُن کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی۔ اُن کے چہرے سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے کسی ذہنی اُلجھن سے نجات حاصل کر لی ہو۔

چادر

چادر

چار سُو اندھیرے کا گھٹا ٹوپ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے

میں ایک بے نام دلدل میں دھنستا جا رہا ہوں۔ ہر طرف سناٹوں کی گرد پھیلی ہوئی ہے۔ اور میرا وجود اپنے کمرے میں داغوں، اور دھبوں والی سفید چادر میں یوں لپٹا پڑا ہے جیسے کوئی لاش کسی قبر میں پڑی ہوتی ہے بالکل تنہا خدائے واحد کی طرح لاشریک۔ اس وقت احساس میرے ذہن کے پتھروں سے کائی کھرچ رہا ہے۔

آج وہ چلی گئی۔ وہ کون تھی؟ رکھیل —— رفیقہ —— داشتہ —— بیوی —— یا محبوبہ؟ لیکن جو بھی تھی وہ اپنی تھی اُس نے میرے دل کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور روح کی زمین پر پروَرِشِ

پائی تھی۔ اُس کے ہوتے ہوئے میں ہمیشہ اپنے جسم کے اندر رہا اور وہ اپنے جسم سے باہر، جب پہلی بار ملی تو اُس نے یہی خون سے لت پت پھٹی ہوئی چادر اُوڑھ رکھی تھی۔ میرے استفسار پہ اُس نے بتایا تھا۔

"اُس شام میں گھر جا رہی تھی اور میری چادر بالکل نئی تھی۔ برف کے گالوں کی طرح سفید اور اُجلی، تبھی زبردست بادل اُمڈ آئے۔ بجلیاں گھن گرج کے ساتھ چنگھاڑنے لگیں اور بارش کی بوندیں تیز تیز کرتی ہوئی زمین کی چھاتی پہ ناچنے لگیں اور مجھے پناہ لینے کے لئے ایک مکان میں داخل ہونا پڑا"

"لیکن بارش تھمنے سے پہلے ہی میں نے اپنے آپ کو تار کول کی سڑک کے کالے وجود پہ دوڑتے ہوئے پایا، پر تب تک چاند کی روشنی اندھی ہو چکی تھی۔ ستاروں نے منہ چھپا لئے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے آسمان کے فرش پہ کالک پوت دی ہو۔ ادھر طوفانی جھکڑوں سے چڑیوں کے گھونسلے پیڑوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر تنکا تنکا ہو چکے تھے اور بے گناہ چڑیاں اندھیرے کے سمندر میں تیر رہی تھیں۔ جہاں زوردار ہواؤں کے تھپیڑے اُنہیں دبوچ دبوچ کر ہلاک کر رہے تھے۔ اُس رات کا منظر لہو لہو تھا۔ ہواؤں کے جسم زخمی ہو چکے تھے اور درختوں کے پتے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اس طرح میں اس خوفناک منظر میں گھر کر گھر کا راستہ بھول گئی اور وقت کے چوراہے پہ آ بیٹھی"۔

"دوسرے دن جب روشنی نمودار ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میری سفید چادر خون سے لتھڑی ہوئی ہے اور تار تار ہو چکی ہے، تبھی میرا ذہن مفلوج ہو گیا۔ دل پارہ پارہ ہو گیا جسم ٹوٹ گیا اور میرا ضمیر میرے جسم سے باہر جا پڑا۔"

اُس چوراہے سے ہر روز میرا گذر ہوتا تھا۔ چونکہ صدیوں سے میری روح کا بدن ننگا تھا اور مُدت سے اوڑھنی کی تلاش میں تھی اور وہ اکیلی تھی اور بے سہارا اس لیئے ایک رات چھُپ کر میں نے اُس کی چادر اُڑالی۔ حالاں کہ اس چادر پہ اب خون کے علاوہ ظلمت کے داغ، بے کسی کے دھبے اور استعمال کے چھینٹے بھی پڑ چکے تھے۔ پھر بھی فرقت کی سردی سے بچنے کے لیئے میں ہر رات اس چادر کو تان کر سو جایا کرتا تھا۔

جب تک وہ یہاں رہی کبھی اپنے اندر دکھائی نہ دی۔ اُس کا وجود تو فقط اُس کے ہونے کی علامت تھا، ورنہ اُسے تو ہمیشہ اپنے آپ سے نفرت رہی لیکن جاتے وقت نہ جانے کیوں وہ اپنا وجود ساتھ لیتی گئی، ظاہر ہے جانے سے پہلے وہ اپنے جسم میں داخل ہو چکی تھی ـــــ اُس کے ہوتے ہوئے میں ہمیشہ اپنے جسم کے اندر رہا، دل کا تابع رہا۔ ذہن کا مرہون منت رہا۔۔۔

آج وہ چلی گئی لیکن یہ چادر آج بھی میرے وجود کے

گرد لپٹی ہوئی ہے۔ لگتا ہے جاتے وقت اُس نے مجھ سے اپنی چادر چھیننے کا انتقام لے لیا اور جانے سے پہلے میرے گرد خون سے لتھڑی ہوئی اس گندی اور بوسیدہ چادر کو لپیٹ کر اُس نے مجھے میرے جسم سے یوں باہر دھکیل دیا کہ اب مجھے اندر داخل ہونے کا کہیں سوراخ نہیں مل رہا جہاں سے بھی اندر جانے کی کوشش کرتا ہوں یہ داغوں دھبوں اور چھینٹوں بھری چادر آگے آجاتی ہے۔ لگتا ہے اب میں کبھی بھی اپنی ذات یا اپنے ضمیر تک نہ پہنچ پاؤں گا۔ وجود کے سارے کیواڑ بند ہو چکے ہیں۔ یا خدا اب کیا ہوگا؟..... ا..... ب..... ک..... یا..... ھ..... و..... گ..... ا.....

چاروں طرف اندھیرے کا گھٹا ٹوپ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے سناٹے کی گرد ہر شے پہ جمتی جا رہی ہے۔ میں کسی گرداب میں دھنستا جا رہا ہوں۔ پانی میرے سر سے اُوپر ہو چکا ہے۔ نیند پلکوں کے دریچوں پہ دستک دے رہی ہے۔ کوئی میری آنکھوں کو سی رہا ہے مجھے سو جانا چاہیئے ورنہ صبح دفتر جانے میں دیر ہو جائے گی ؏

ہوش مند

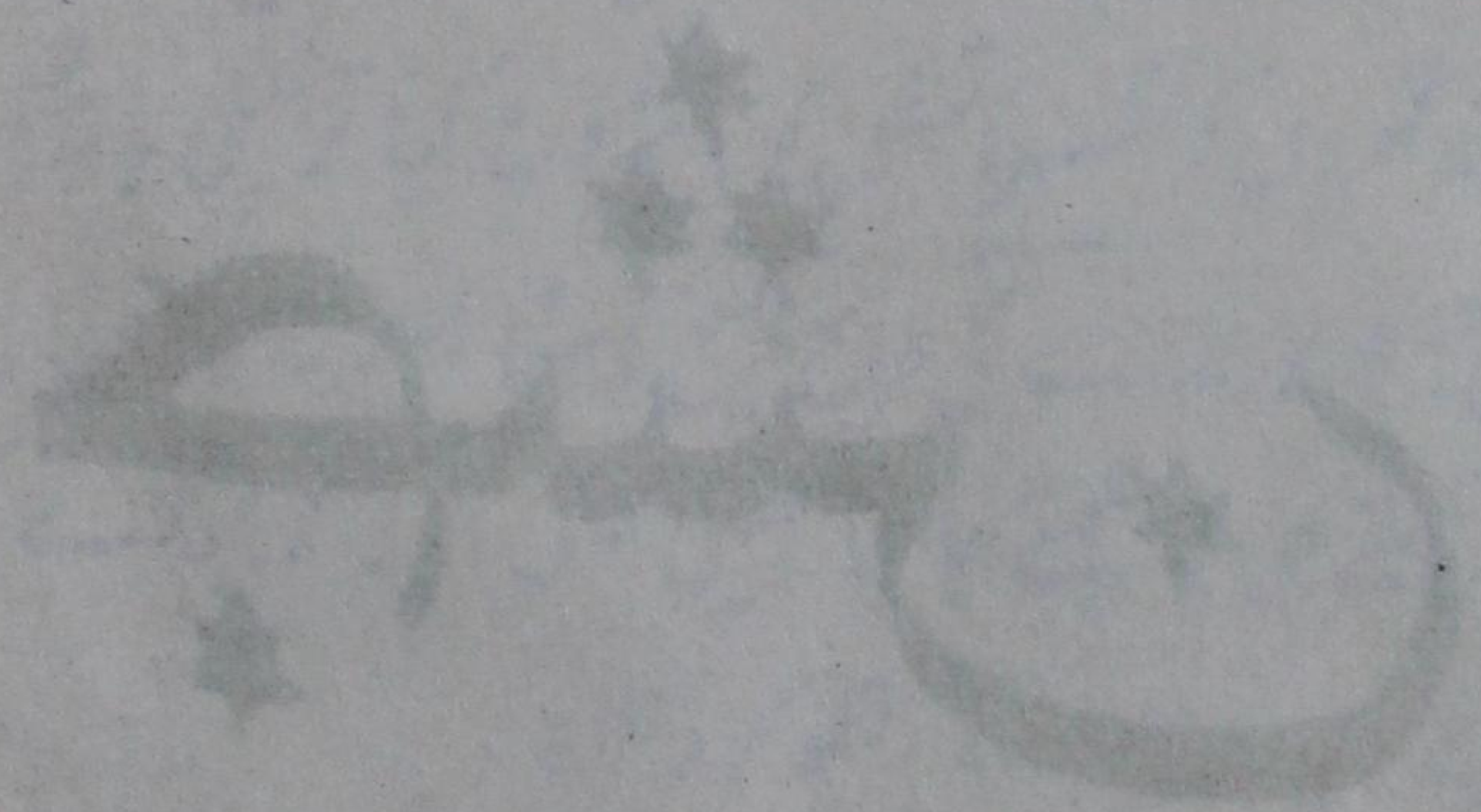
ہوش مند

اُسے سب پاگل کہتے تھے، بات بھی صحیح تھی وہ بات
بات ہنستا جو رہتا تھا۔ اور اُس کے زرد بائیں گندے اور میلے دانتوں کی بتیسی
شہر کی اُس سرائے کی طرح ہمیشہ کھلی رہتی تھی جس کے دروازے ٹوٹ چکے
تھے۔ جب لُچّے شرارتی بچے پتھر مارتے ہوئے اُس کا پیچھا کرتے تو وہ مسکراتے
ہوئے بازار کی ایک نکڑ سے دوسری نکڑ کی طرف کالا نچیں بھرتا ہوا دوڑ جایا
کرتا تھا، وہ اُس وقت بھی کھل کھلا کر ہنسا کرتا جب اہلِ ہوش اپنی ذوقِ نظر
کی تسکین کے لئے اُس کے جسم کے گرد لپٹے ہوئے چیتھڑوں کو اور بھی تار
تار کر کے اُسے چڑانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ
وہ اُس روز ہنسا تھا جب کسی من چلے نے ایک رات اُس کی جھونپڑی کو
آگ لگا دی تھی اُس وقت وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے والے چوراہے

پہ آ بیٹھا تھا اور کڑا کے کی سردی میں ساری رات قہقہے لگا لگا کر ہنستا رہا تھا۔ آج تک کسی نے اُس کے چہرے پر ملال کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ پاگل جو تھا۔

لیکن جس روز تشدد شہر کے ہر حصّے میں چیچک کے دانوں کی طرح پھوٹ نکلا۔ ہوش مندوں نے ایک دوسرے کو پتھر مار مار کر لہو لہوہان کر دیا۔ اپنی اُجلی اُجلی پوشاکوں کی دھجیاں ہواؤں میں بکھیر دیں اور پھر جب بسے بسائے گھروں کو نذرِ آتش کرنا شروع کیا تو پہلی بار شہر کے چوک میں کھڑا پاگل کسی جنگلی درندے کی طرح چیخ اُٹھا اور زار و قطار رونے لگ پڑا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جا بجا پھیلی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش میں اُس نے اپنے آپ کو جلا کے راکھ کر ڈالا۔

جشن



جشن

رات کے سر کا ہر بال کالا ہو چکا تھا اندھیرے کی دھند
بارود کے دھوئیں کی طرح سارے میں پھیل رہی تھی اور رات کی سیاہی
ڈال ڈال پات پات پہ یوں جمتی جا رہی تھی جیسے محبت کے رشتوں پہ
وقت کی کائی جم جایا کرتی ہے۔ آسمان کا ہر ستارہ ساڑھی پہ لگی چمکیش
کی طرح دمک رہا تھا اور پہاڑی سلسلوں کے دامن میں واقع پونچھ کا
چھوٹا سا خوبصورت شہر رات کے پہلے ہی حملے پر سنسان اور سکوت
زدہ لگ رہا تھا۔ گرد و نواح کی فلک بوس پہاڑیوں پہ ڈھینوں کی لاغر
اور کمزور روشنیاں آسمان کے ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں دور
ڈھلوانوں سے جھرنوں کے گرنے کا سائیں سائیں کرتا ہوا شور بلند ہو رہا
تھا یا دریاؤں کے پانیوں کے سرکنے کی سرسراہٹ آ رہی تھی اور آوارہ

کتوں کے بھونکنے اور رونے کی صدائیں کھوڑی نار اور پنج سکرڈیاں کے پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھیں اور چمگادڑ پھڑ پھڑاتے ہوئے سرو اور یوکلپٹس کے چھتنار درختوں سے بچھڑ بچھڑ کر مغرب کے میدانوں کی طرف محوِ پرواز تھے۔ یا پھر اُس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی ساتھ چنار کے سوکھے ہوئے پتوں کے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آرہی تھی اور اُس کے قدم سبک رفتاری کے ساتھ سرجن رام پال کے کوارٹر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ ڈیوڑھی پر پہنچتے ہی اُس نے کواڑ کھٹکھٹایا جہاں اندر سے بہت سے مردوں عورتوں اور بچوں کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ اِدھر ڈیوڑھی کے سوراخوں سے چھن کر روشنی نو وارد پر پڑ رہی تھی جس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے تیر رہے تھے اور آنکھوں میں تھکن اور چہرے پر غمگینی کے آثار نمایاں تھے اُس کے ہونٹوں پہ جمی پپڑی سے لگ رہا تھا جیسے تپتی دھوپ میں ریگستانوں کو پار کر کے آرہا ہو۔ اُس کے بوٹ دھول سے اٹے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ پچیس ۲۵ سال کا گٹھیلا خوبصورت اور تنومند یہ نوجوان مایوسی کے گرداب میں گھرا ہوا لگ رہا تھا۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد وحشت اور اضطراب کے عالم میں اُس نے دروازہ زور زور سے تھپتھپانا شروع کیا۔ تبھی کواڑ کھلا تو ہسپتال کا چپراسی سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے کاندھے پہ اُجلا تولیہ جھول رہا تھا۔ خاکی وردی میں ملبوس چپراسی کے ہاتھوں میں ٹرے، منہ میں نسوار اور آنکھوں میں سوال تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں" نووارد نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اور خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سرجن صاحب پارٹی میں مصروف ہیں" چپراسی نے بے رُخی سے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے سرجن صاحب سے ملنا ہے بھائی" نووارد نے چپراسی کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "میری بیوی اُمید سے ہے اور اچانک بیمار ہوگئی ہے۔ ہم اُسے بڑے ہسپتال اُٹھا لائے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر آج رات آپریشن نہ ہوا تو اس کا بچنا مشکل ہے تم سرجن صاحب سے کہو کہ وہ آپریشن کردیں میں منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں" —— "اُن کے ہاں اُن کی شادی کی سالگرہ کے موقعہ پہ دعوت چل رہی ہے بھائی اس وقت اُن کا پارٹی سے اُٹھ کر آنا ممکن نہیں" چپراسی نے جواز پیش کیا۔

"اور میرا خالی لوٹ جانا ناممکن ہے میں اُنہیں لے کر ہی جاؤں گا" نووارد نے مصمم ارادے سے کہا۔

"اُن کا گھر مہمانوں سے بھرا ہے وہ سب کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں" چپراسی نے کہا۔

لیکن میرا دل وسوسوں سے بھرا ہے اگر وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ تم سرجن صاحب سے کہو تو سہی آخر وہ بھی

ہمارے ہی گاؤں سرن کوٹ کے رہنے والے ہیں ہمارے اپنے ہیں وہ ضرور مان جائیں گے۔" نو وارد نے گڑگڑاتے ہوئے جب چپراسی سے التجا کی تو اُس کا دل پسیج گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا" چپراسی نے خشخشی کھچڑی داڑھی میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"گوتم" نو وارد نے جواب دیا۔

"اچھا تم یہیں ٹھہرو، میں بات کرتا ہوں"

اتنا کہہ کر چپراسی اندر کی طرف مُڑ گیا اور گوتم بنگلے کی چوکھٹ پہ یوں کھڑا رہا جیسے کوئی فقیر روٹی کی آس میں گرہستی کے در پہ کھڑا ہوتا ہے۔ چپراسی لال، گلابی اور پیلے نیلے چمیلی گلاب اور نرگس کے کنجوں سے ہوتا ہوا بنگلے کے برامدے کی طرف جا رہا تھا جہاں خوب چہل پہل تھی۔ معززین خوش گپیاں اُڑا رہے تھے۔ ہنسی کے فوارے اور ہاہا اور واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ آوازیں اس وقت گوتم کے کانوں کو اس طرح کھرچ رہی تھیں جیسے چڑھتے طوفان کنارے کی زمینوں کو کاٹ دیتے ہیں۔ اُس کے اندر ہل چل مچی ہوئی تھی اور ذہن میں نفرت کے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ننھا توکا شدتِ درد سے چیختا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا۔

اُس نے سوچا اگر سرجن صاحب آپریشن کے لئے نہ آئے تو......

اُدھر سرجن رام پال دوستوں، رفیقوں اور جانثاروں میں

گھرے ہوئے خوشی اور مسرت سے جھوم رہے تھے بجلی کی سلائیڈوں کی نقرئی دودھیا کرنیں چکا چوند کر رہی تھیں ہواؤں کے جھونکوں سے سرسراتے ہوئے رنگین پردے آنے جانے والوں سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ کارنر ٹیبلوں پہ حسین اور جاذب نظر پھولوں کے گلدستے، صراحی دار گلدانوں میں یوں سجائے گئے تھے جیسے شادی کے موقع پہ دلہن سجائی جاتی ہے۔ راؤنڈ ٹیبل پر پڑے ریڈیو گرام سے انگریزی دھنیں اُٹھ رہی تھیں۔ صوفہ سیٹوں پہ بیٹھی خوبصورت عورتیں مردوں کے ساتھ چہک چہک کر باتیں کر رہی تھیں اور ان پڑھ امیر پڑھے لکھے افسروں پہ اپنی علمیت کا سکہ جمائے جا رہے تھے۔

ادھر مسز رام پال صبح کے گلاب کی طرح جوان اور جاذب نظر، شوخ اور شگفتہ، نرم اور نرمل، بھرپور اور پُرجوش اور جوانی کے نشے میں مدہوش لگ رہی تھیں۔ اس وقت اُس نے ہرے رنگ کی ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی جس پہ سنہرے تلے سے چھوٹے چھوٹے مور بنائے گئے تھے۔ جو مسز رام پال کی شوخ رفتاری کے ساتھ ساتھ ہلتے اور چلتے ہوئے لگتے تھے وہ ہواؤں کے جھونکوں میں زلفیں لہراتی اور پلو اڑاتی ہوئی جھوم جھوم کے مہمانوں کی نشستوں میں گھوم رہی تھیں اُس کے وجود کی چہک، گالوں کی تمتماہٹ ہونٹوں کی اُڑی اُڑی رنگت، چھاتیوں کی اُٹھان اور نظروں کی بے تابی حسن کا دل فریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس وقت اُس کا حسن عروج پہ، جوانی شباب پہ اور ذہن عرش

پر تھا اُس کے چہرے سے حکومت کا رعب اور امارت کا طنطنہ ٹپک رہا تھا۔ ایک عورت کو آخر کیا چاہیئے؟ شوہر، جس کا دل نرم اور جیب گرم ہو۔ اور یہ دونوں اوصاف ڈاکٹر رام پال میں موجود تھے۔

غلام گردش میں نوکر اور چپراسی سروں کو نیہوڑائے اور نظروں کو جھکائے ہوئے آقاؤں کا حکم بجا لانے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ گوتم سوچنے لگا، آقا آج بھی ہیں اور غلام آج بھی ہیں، فقط نام بدلے ہیں اُن کے انداز بدلے ہیں جمہوریت تو ہے لیکن آج بھی سرمایہ داروں کی جھولی میں سکے گر رہے ہیں اور غریبوں کی جھولی میں نعرے جن کی آس پہ وہ بھوک اور افلاس کی زندگی گذار دیتے ہیں کہ شاید کبھی ان نعروں کی تعبیر نظر آئے۔

اب مہمانوں سے ایک معزز شخص ایک نکڑ میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے چمکتے ہوئے کالے بوٹ پہ گرم نسواری سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس خوش رنگ اور خوش طبع شخص جس کی عُمر چالیس کے لگ بھگ اور کمر ایک بڑے ڈھول کے برابر لگتی تھی مہمانوں سے اس طرح مخاطب ہوا۔

سُنئے صاحبان! میں اس مبارک تقریب میں اپنی اور آپ سب کی طرف سے مسٹر اور مسز رام پال کو اُن کی شادی کی پہلی سالگرہ پہ مبارک دیتا ہوں (تالیاں) پچھلے سال آج ہی کے دن سرجن رام پال کو کورٹ میرج کرنا پڑی تھی۔ کیوں کہ ان کے ماں باپ اپنے ہی گاؤں

سُرن کوٹ کی ایک گنوار لڑکی سے ان کی شادی کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اُن کی نظر میں دونوں نے بچپن سے محبت کی تھی اور شادی کے وعدے کئے تھے جس کا سرپنچ صاحب کو اعتراف بھی ہے اور احترام بھی لیکن محبت صرف عبت کیلئے کی جاتی ہے، شادی کے لئے نہیں۔ محبت تو جاگتی آنکھوں کا سپنا ہوتا ہے جو جوانی کے ساون میں عشق کی راہوں پہ اپنائیت کی چھاؤں تلے بیٹھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اور شادی تو بندھن ہوتا ہے جو حالات اور ماحول کے مطابق ہو تو پائیدار ہوتا ہے ورنہ ٹوٹ جاتا ہے اور زندگی بے رنگ بے سُود اور کرکری ہو جاتی ہے۔ گاؤں کی اُس لڑکی کی دُنیا تو چولہے اور چشمے تک محدود تھی وہ تو وقت کی دوڑ اور زندگی کی ہوڑ میں ساتھ دینے کے قابل نہ تھی۔ یہی سوچ کر سرپنچ رام پال نے اُس سے شادی کرنے کے بجائے اپنی ہم خیال اور پُرجمال ساتھی میس انیتا سے کورٹ میرج کر لی (پُرزور تالیاں)، اس طرح پچھلے سال وہ اپنی شادی کی تقریبات کو من مرضی سے منا نہ سکے۔ لیکن آج پہلی سالگرہ پہ یہ اپنے سارے ارمان پورے کر لینا چاہتے ہیں۔ یہ جشن وہ اس انداز سے منانا چاہتے ہیں کہ اس کی خوشبو اُن کے دماغ میں زندگی بھر بسی رہے"

(زوردار تالیاں)

وہ صاحب اب اپنی نشست پہ لوٹ آئے تھے اُدھر کوکا کولا اور ٹھنڈی یخ بیئر کی بوتلوں سے ڈھکن اُڑنے لگے۔ اور

بیرے کے گلاس جن سے بلبلے اُٹھ رہے تھے ٹرے میں سجائے بیرے مہمانوں میں تقسیم کر رہے تھے اور بھینی بھینی خوشبو سارے ماحول میں پھیل رہی تھی۔ اور تلی ہوئی مچھلی، تکے، کباب، کاجو اور چپس کی پلیٹیں زوروں سے گردش میں تھیں ادھر برآمدے کے باہر خوبانی اور ریلمپ کے پیڑ گوتم کی طرح اُداس اور خاموش اس نظارے کو دیکھ رہے تھے۔ اور گوتم سوچ رہا تھا کہ اگر شانو کا علاج وقت پر نہ ہوا تو شاید کبھی بھی اُس کی زندگی میں شادی کی سالگرہ نہ آ سکے گی پھر اُس نے دیکھا کہ آخر کار چپراسی سرجن صاحب کے پاس جا پہنچا ہے اور گوتم کی طرف اشارہ کر کے اُن سے کچھ کہہ رہا ہے ادھر گوتم آس اور اُمید لیے حسرت بھری نظروں سے سرجن صاحب کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ ڈاکٹر کی چوکھٹ پہ نہیں بلکہ کسی مقدس آستان پہ اپنی مراد کی بار آوری کے لئے دُعا گو کھڑا ہو تھوڑی دیر کے بعد چپراسی غلام گردش سے ہوتا ہوا پھولوں کے کنجوں کو پھاندتا ہوا گوتم کے پاس آیا جو اُسی کی رہ دیکھ رہا تھا۔

"بھائی سرجن صاحب بہت مصروف ہیں کہتے ہیں ایک گھنٹے کے بعد پتہ کرنا اگر دعوت ختم ہو گئی تو ضرور تمہاری بیوی کو چل کر دیکھ لیں گے" اتنا کہہ کر چپراسی نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر دیا۔

(۴)

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد سرجن رام پال کے کواٹر

پہ سپھر دستک ہوئی چپراسی نے دروازہ کھولا تو باہر گوتم کھڑا ہانپ رہا تھا۔
اور اُس کے چہرے سے خوف اور وحشت ٹپک رہی تھی۔

" دعوت ختم ہوئی کہ نہیں" گوتم نے دریافت کیا۔

" نہیں ابھی نہیں" چپراسی نے کہا۔

" نرس کہہ رہی ہے کہ اگر میری بیوی کا اپریشن نہ ہوا تو وہ ختم ہو جائے گی" میں خود ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتا ہوں اتنا کہہ کر وہ اُس طرف بڑھ گیا جہاں پارٹی چل رہی تھی اور محفل اپنے شباب پہ تھی وہاں بیئر کے بعد اب سکاچ کے دور چل رہے تھے۔ اور خالی بوتلیں خالی چہرے اور خالی ذہن گوتم کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف شراب اور سیگرٹوں کی بو پھیلی ہوئی تھی اور با اخلاق اور تہذیب یافتہ لوگ بیہودہ باتیں۔ لچر چٹکلے اور رکیک جملے یوں بول رہے تھے جیسے ان پڑھ دیہاتی زمینوں کے جھگڑوں پہ اپنے حریفوں سے بولتے ہیں۔ گوتم مہمانوں سے گذرتا ہوا سرجن رام پال کے پاس جا پہنچا۔ تبھی سرجن صاحب اُسے پہچانتے ہوئے اور بوجھل سُرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولے۔

" ابھی ایک گھنٹہ اور لگے گا بھائی"

" میری بیوی کی حالت بگڑ رہی ہے۔ [illegible] اُس کے لئے ایک گھنٹہ ایک زندگی [illegible] ثابت ہو سکتا [illegible]

آپ اُس کا آپریشن کر دیں، میں منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں" گوتم نے درخواست کی۔

"تو کیا میں دعوت ختم کر دوں، آپریشن چٹکیوں کی بات نہیں ہوتی اس کے لیے وقت چاہیئے اور اس وقت میں مصروف ہوں"

سرجن صاحب طیش میں بول رہے تھے۔

"اگر ہمدردی ہو تو وقت نکل سکتا ہے سرجن صاحب! اور اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو میری دُنیا لُٹ جائے گی میں پاؤں پڑتا ہوں، میری بیوی بچا لیجئے" گوتم گڑگڑاتے ہُوئے بول رہا تھا۔

"یہاں جو بھی آتا ہے جلدی میں ہوتا ہے۔ خوشی چاہیئے تو راحت چاہیئے۔ سب کو اپنی اپنی دُنیا سے واسطہ ہے کوئی نہیں سوچتا کہ ڈاکٹر کی بھی ایک دُنیا ہے۔ اُس کی بھی بیوی ہے۔ سینے میں دل ہے جس کے لیئے اُسے بھی خوشی چاہیئے۔ کیا ایک ڈاکٹر کو اتنا بھی حق نہیں کہ اپنی خوشی میں شریک ہو سکے۔ آج کی رات میری رات ہے اور میں تمہارے لیئے اپنی یہ رنگین شام خراب نہیں کروں گا"

سرجن رام پال شراب کے نشے میں بولے جا رہے تھے

تبھی اُن کی نظر گوتم کے چہرے پر پڑی جو ڈاکٹر کے رعب اور بیوی کی بیماری کی دہشت سے اتنا پیلا لگ رہا تھا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ یہ دیکھتے ہی سرجن صاحب نے اپنے آپ پہ قابو پا لیا اور

گوتم کو دلاسا دیتے ہوئے بولے۔

"دیکھو میں انجکشن لکھے دیتا ہوں تم نرس سے کہو اُسے لگا دے۔ اِس سے تمہاری بیوی کو نیند آجائے گی اور جب دعوت ختم ہو گی تو کیس کو میں خود سنبھال لوں گا" سرجن صاحب نے گوتم کو انجکشن لکھ دیا جسے لیکر وہ کوارٹر سے باہر آگیا۔

(۳)

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ شراب کا آخری دور ختم ہو چکا تھا اب دسترخوان پہ کھانا لگا دیا گیا تھا اور سرجن رام پال اور اُن کی اہلیہ محترمہ مہمانوں کو کھانے کی میز پہ بُلا رہے تھے۔ مہمانوں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ گوتم جس کے چہرے سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کسی دلوانے کی طرح دسترخوان پہ آدھمکا جسے دیکھتے ہی سرجن رام پال لال پیلے ہو گئے۔ ایک تو وہ نشے میں چور تھے اوپر سے گوتم کے بار بار دق کرنے پر جلال میں آگئے۔

"تم پھر آگئے!" وہ گرجے

"حضور وہ بالکل خاموش ہو گئی ہے نہ بولتی ہے نہ حرکت کرتی ہے" گوتم روتے ہوئے بول رہا تھا۔

اور تم سب کو خاموش کر دینا چاہتے ہو چلے جاؤ، ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گا" آگ بگولہ سرجن کی آنکھوں سے شعلے اور غصہ

نے چھاتی نکال رکھی تھی۔

دنیا دیکھے سرچن صاحب کی جوتی ...... لیکن سرچن

... تو ... دیکھتے ... کی مینڈ ڈالی سے

... اس کو والد ... تو ... چاپ آ بیٹھے

۳

بہت ... جلتی رہی تقریباً آدھی رات کے بعد

مہمانوں نے جانا شروع کیا ... تک سرچن صاحب سب کو بخیر

کے آئے ہوئے تھے۔

مہمانوں کو ... کے بعد جب مسٹر سرچن صاحب واپس

... تو اُن کے کانوں میں جے شنکر ... جے شنکر کے کیرتن کرنے والوں

کی صدائیں پڑیں۔ انہوں نے دیکھا تو سامنے کے پیڈ گراؤنڈ میں سادھوؤں کی

ایک ٹولی گیرو ... کپڑوں میں ... الاؤ کے گرد بیٹھے کھڑتالیں اور

مردنگ بجاتے ہوئے گلے پھاڑ رہے تھے۔ انہیں ... آیا یہ سادھو چندہ

مانگنے کل ہسپتال آئے تھے تاکہ امرناتھ جی کی یاترا پر جا سکیں۔ تبھی انہوں

نے جے شنکر کی آواز کو دماغ سے یوں نکال باہر کیا جیسے وہ دفتر کی فائل

سے ردی کے ٹکڑے نکال باہر کیا کرتے تھے۔ اس وقت شراب اُن

کی شریانوں میں داخل ہو چکی تھی۔ اور اُن کا ذہن پوری طرح نشے کی

گرفت میں تھا۔ وہ ڈوبتی نظروں اور لڑکھڑاتے قدموں سے بگلے کے

کھمبوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں سیٹی بجاتے ہوئے دھیرے دھیرے گھر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ جب وہ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے پہلو سے گذرنے لگے تو انہیں کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اچانک انہیں گوتم یاد آگیا اور کسی غیبی کشش کے سبب اُن کے قدم ایمرجنسی وارڈ کی طرف مُڑ گئے۔ اندر گوتم رو رہا تھا اور بیڈ پہ پڑی ہوئی اُس کی بیوی کا مُنہ سفید چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔

"مجھے معاف کردو بھائی میں دعوت میں مصروف رہا اِس لئے دیر ہوگئی بتاؤ کیا تکلیف ہے ابھی دیکھ لیتے ہیں" ڈاکٹر نے کہا

"آپ کی دعوت نے میری دُنیا اندھیری کردی سرجن صاحب آپ کی شام تو حرام نہ ہوئی لیکن میری بیوی حرام ہوگئی" گوتم روتے ہوئے بول رہا تھا۔

سرجن صاحب نے سوچا شاید ابھی زندہ ہو اِسی خیال سے اُنہوں نے لڑکی کے چہرے سے جو چادر ہٹائی تو لرز گئے اور ایک لمحے کے لئے اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے اُن کا ہاتھ بجلی کی ننگی تار پہ جا پڑا ہے۔ اُن کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ تو شانو تھی سرجن رام پال کی محبوبہ اُن کی چڑھتی جوانی کی یادگار۔ خوابوں کی شہزادی حسن کی ملکہ۔ گاؤں کی رانی۔ جس سے کبھی سرجن صاحب نے محبت کے کھیل کھیلے تھے۔ عشق کے رموز سیکھے تھے۔ جس کے ساتھ ساون کے بادلوں میں چنار کے درختوں

تلے باہوں میں باہیں ڈالے سرجن رام پال نے شانو کے دل کی دھڑکنیں سُنی تھیں۔ گرم سانسوں کے لمس اور نرم باہوں کی حرارت سے پہلی بار روشناس ہوئے تھے۔

شانو جس کا حُسن برت کے گالوں کی طرح شفاف اور ساون کے بادلوں کی طرح پُرجوش اور بھرپور تھا اُس کے سامنے مری پڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے دیئے بجھ چکے تھے اور ہونٹوں سے الفاظ کے پنچھی اُڑ چکے تھے اور اُسے دیکھ کر سرجن رام پال تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ یہ اُن کی شانو نہیں کوئی اور لڑکی ہے اور شراب کے نشے میں اُنہیں اس لڑکی کا چہرہ شانو سے ملتا جلتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے گوتم سے دریافت کیا۔

”کیا نام ہے اِس لڑکی کا؟“

”شانو“

”گاؤں“

”سرن کوٹ“

”کب ہوئی تھی آپ دونوں کی شادی“؟

”نو ماہ پہلے“

گوتم روتے ہوئے دھیرے دھیرے جواب دے رہا تھا اور سرجن رام پال کا دل شیشے کے ٹکڑے کی طرح اِن چھناکوں

سے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ یہ تو اُن ہی کی شانو تھی جیسے وہ گاؤں چھوڑ آئے تھے۔ وہی گلاب کی پتیوں کی طرح کومل ہونٹ۔ لمبی ناک، خمیدہ ٹھوڑی۔ پھولے ہوئے گال اور سُنہرے بال۔ ہر نقش وہی تھا لیکن ہر نقش دھندلا چکا تھا۔ اس وقت اُس کی آنکھوں میں چمک تھی نہ چہرے پہ مُسکان بلکہ مرے ہُوئے چہرے پہ عجیب قسم کی تلخی، کرب اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے شانو، اُن کی جوانی کی پہلی فرمائش اُن کے ہی آنگن میں تڑپ تڑپ کے دم توڑ گئی اور وہ شراب کے دور چھلکاتے رہے۔

یہ سوچتے ہی سرجن صاحب نے سوچا کہ وہ ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ ایک ریچھ ہیں جو شراب نہیں بلکہ اپنی محبُوبہ کا خون پی رہے تھے۔ اُن کا سر چکرانے لگا اور کلیجہ مُنہ کو آتا ہوا محسوس ہوا۔ اور وہ ایک مجرم کی طرح شانو کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ تبھی انہیں شانو کے ساتھ اپنی آخری ملاقات یاد آئی جب گاؤں کے چشمے پہ ناکھ کے درخت کے پیچھے سنبھلوں کی گھنی جھاڑیوں کی اوٹ میں وہ اُس سے ملے تھے اور شادی کرنے سے انکار کیا تھا تو شانو نے کہا تھا۔

"تم تو کہتے تھے زندگی بھر اکٹھے رہیں گے۔ تم تو میرے لئے سُورج تھے اور میں سُورج مکھی کی طرح تمہارے گرد طواف کرتی رہتی تھی کیا اس لئے کہ وقت آنے پہ تم مجھے منزل کے بجائے موت کی طرف دھکیل دو تم بھول جاؤ گے۔ اس لئے کہ تم مرد ہو اور تم نے صرف زبان

دی تھی ۔ میں یاد رکھوں گی ۔ اس لئے کہ میں عورت ہوں اور میں نے دل دیا تھا ۔ اب ایک دوسرے کو بھلا بھی دیں تو بھی محبت کا رشتہ قائم رہے گا لیکن اب یہ رشتہ میرے دل میں دفن رہے گا کبھی لب تک نہ آئے گا جب تک میں زندہ ہوں " اتنا کہہ کر وہ جنگل میں بھاگتی ہوئی بھیر وہیوں کے جھنکاروں کے پیچھے چلی گئی تھی اور ناکھ پہ بیٹھی اکیلی کوئل پی ہو، پی ہو کرتی رہ گئی تھی اب کے ڈاکٹر رام پال کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جنہیں دیکھتے ہی گوتم طیش میں آ گیا ۔

" یہ مگرمچھ کے آنسو کس لئے سرجن صاحب، آپ تو قاتل ہیں اور قاتل رویا نہیں کرتے ۔"

" کبھی کبھی قاتل بھی رویا کرتے ہیں گوتم ۔ میں تمہارا گناہ گار ہوں تم مجھے جو چاہے سزا دو ۔ گوتم مجھے معاف کر دو تم ۔"

سرجن روہانسو انداز میں بول رہے تھے ۔

" کیا بھگوان تمہیں معاف کریں گے ؟ تمہارا ضمیر تمہیں معاف کرے گا ؟ شانتو کی روح تمہیں معاف کرے گی ؟ اگر نہیں تو پھر میں تمہیں کیوں معاف کر دوں ، شانتو میری بیوی ہے ۔ اس لئے اس غم کی رات کے ایک اک لمحے پہ میرا حق ہے ۔ اس کے دُکھ اگر تم بانٹ نہیں سکے ۔ تو اس کے سوگ میں کیوں شریک ہو رہے ہو ۔ تم جاؤ اور اپنی شادی کی سالگرہ کا جشن مناؤ " گوتم نے دل کا غبار نکالتے

ہوئے کہا۔

"ایسا نہ کہو گوتم۔ تم مجھے اپنے درد میں شامل کر لو۔ اپنے غم کا حصہ دار بنا لو ورنہ زندگی بھر مجھے چین نہیں ملے گا۔" سرجن رام پال نے گڑگڑاتے ہوئے گوتم سے التجا کی

"ڈاکٹر کا تعلق تو دُکھیا سے ہوتا ہے اور دُکھیا تو اپنا دُکھ اوڑھ کر کب کا موت کے سمندر میں کود چکا ہے۔ اب ڈاکٹر کا کیا کام۔ یہ کمرہ آج رات کے لئے میں نے کرائے پر لیا ہے سرجن صاحب! اس لئے اس کمرے میں آج وہی رہے گا جسے میں اجازت دوں گا۔ آپ شرافت کے ساتھ باہر چلے جائیں ورنہ میں دھکے دے کر نکال دونگا۔" گوتم جوش میں آ چکا تھا۔

"گوتم تم نہیں جانتے کہ شانو سے میرا کیا رشتہ ہے۔ جیتے جی میں اُسے دوا تک نہ دے سکا اور اب اگر کندھا بھی نہ دے پایا تو تا حیات تڑپتا رہوں گا" ڈاکٹر رندھے ہوئے گلے سے بول رہے تھے۔

"نکل جاؤ یہاں سے نہیں تو میں تمہارا خون کر دوں گا۔" اتنا کہہ کر گوتم نے سرجن رام پال کو ٹھیک اس ایمرجنسی وارڈ سے دھکیل باہر کیا جیسے سرجن صاحب نے گوتم کو اپنے کوارٹر سے نکالا تھا۔

(۵)

باہر رات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ٹوٹ رہی تھی۔ ستاروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں گلیوں کے نکڑ پہ آوارہ کتے رات بھر بھونکنے اور رونے کے بعد پاؤں پہ سر رکھ کر سو چکے تھے۔ چمگادڑ مغرب کی اڑان سے واپس لوٹ رہے تھے۔ جھرنوں کا پانی وادیوں کے دامن میں سمٹ رہا تھا۔ اُدھر سرجن رام پال ایمرجنسی وارڈ کے باہر ایک چبوترے پہ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی مسافر پلیٹ فارم پہ بیٹھا گاڑی کا انتظار کر رہا ہو۔ اس وقت اُن کے سامنے تین راستے تھے۔ پہلا راستہ اُن کے گھر کی طرف جا رہا تھا جہاں اُن کی بیوی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ دوسرا راستہ پریڈ گراونڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں ننگے سادھو بھگوان کی لگن میں مگن جے شنکر، جے شنکر کا کیرتن کئے جا رہے تھے اور تیسرا راستہ ایمرجنسی وارڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اُن کی محبوبہ برف کی چادر میں لپٹی ہوئی آگ کی لپٹوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ڈاکٹر رام پال اس وقت ان تینوں راستوں کے درمیان کھڑے تھے اور گھڑی گھڑی اُلجھتے جا رہے تھے۔ اس وقت اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا نہایت مشکل تھا کہ وہ ان تین راستوں میں سے کس کو لبیک کہیں؛

آخری تاریخ

آخری تاریخ

آج ایک تو مہینے کی آخری تاریخ تھی اوپر سے اتوار یعنی ایک
تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔ ہم صبح کا اخبار پڑھتے ہوئے چائے کی چسکیاں لے
رہے تھے کہ بیگم نے گھی کے خالی ڈبے کا طبل بجا کر رسوئی گھر کے خلاص
ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ انہوں نے ہماری اطلاع کے لئے فرمایا کہ پچھلے
تین دنوں سے ادھار مانگ مانگ کر جو آٹا بچ رہا تھا وہ بھی آخری دموں
پر ہے اور چینی کے مرتبان کو کھرچ کھرچ آخری ذرّیاں جو صبح کی چائے
میں ڈالی گئیں تب جا کر کہیں چائے گلابی ہوئی تھی۔ اِدھر ہماری جیب کا
یہ عالم تھا کہ آخری کوڑی بھی کب کی دوکاندار کے ترازو پر اپنا مول ادا
کر چکی تھی۔ ویسے تو یوں بھی ایک ملازم کے لئے مہینے کے آخری دن
بڑھاپے کے دنوں کی طرح بڑے دل خراش ہوا کرتے ہیں لیکن اس بار

غضب یہ ہوا تھا کہ پہلے پندرھواڑے میں ہی خالہ جان چار بچوں سمیت آ دھمکیں تھیں اور آتے ہی انہوں نے ہمارے مہینے کے مالی بجٹ پر ایسی گھات لگانی شروع کی کہ اُن کا مسئلہ اٹھانے تک ہماری جیبیں لول گئی تھی۔

پہلی نظر میں بیگم کے اس بیان پر ہمیں چار سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا لیکن جب اس مسئلے پر سوچنے لگے تو قدرتی ایک شاندار ترکیب سوجھی اور ہمارے چہرے پر رونق عود کر آئی۔ ہم نے مسکراتے ہوئے بیگم سے کہا کیوں نہ آج کا دن ملہوترہ صاحب کے ہاں گزارہ جائے۔ خود انہوں نے بھی کئی بار مدعو کیا ہے۔ ایک تو چھٹی کا دن ہے خوش گپیوں میں گذرے گا اور پھر سے کھانے والے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہماری بیگم کو یہ ترکیب اور بھی پسند آئی کہ چلو آج چولہے میں سر دھننے سے فراغت تو ملی۔ ہم جلدی جلدی تیار ہو گئے تاکہ دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی ملہوترہ صاحب کے ہاں پہنچا جائے لیکن ہم دروازے کو بند کر کے ڈیوڑھی پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے ملہوترہ صاحب اپنی اہلیہ محترمہ اور تین شرارتی بچوں سمیت آتے ہوئے دکھائی دیئے اور چھوٹتے ہی فرمانے لگے۔

"کہو بھائی کیا حال ہے تم روز بلایا کرتے تھے نا آج ہم نے سوچا کہ چھٹی کا دن ہے تمہارے ہاں ہی خوش گپیاں بھی لگائیں گے اور دعوت بھی کھاتے آئیں گے۔" ٭

بیڑا ہاف

ہیڈ ماف

اور پھر یوں ہوا کہ اُس کی شادی ہو گئی اور میرے اندر
کے انسان کو اِس شہر کی دیواروں میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اس حادثے
کی تاب لانا میرے بس کی بات نہ تھی، اسی لئے میں نے یہ شہر چھوڑ دینے
کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چونکہ میں یہاں کی گلیوں میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرا ہوا ہوں
اور ممکن نہیں کہ پورے کا پورا واپس جا سکوں پھر بھی اپنے آپ میں جو
کچھ بچا ہوا ہے۔ میں اُسے سمیٹ کر باندھ چکا ہوں تا کہ تنہائیوں اور تاریکیوں
کے سفر میں کچھ تو ساتھ چلے۔

میری روانگی میں ابھی پورے دو گھنٹے باقی ہیں اور مجھے
معلوم ہے کہ دو گھنٹوں بعد وہ آخری سلام کہنے کے لئے میرے دروازے
پر دستک دے گی۔ یہ دو گھنٹے میں اپنے گھر میں اور اپنے آپ میں

بڑی آسانی کے ساتھ بسر کر سکتا ہوں۔ لیکن میں تو روانگی سے پہلے ہی اپنے آپ سے روانہ ہو چکا ہوں۔ اور اس وقت زمان و مکان کی حدوں کو پھلانگ کر اس چٹان پر آ بیٹھا ہوں جہاں ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہوتے ہوئے ہوا کے تیز رفتار جھونکوں کی طرح دائیں بائیں سے گذر رہے ہیں۔ آج پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ جب سے میں نے سوچنا شروع کیا ہے میں اسی چٹان پر بیٹھا ہوا ہوں۔ اور جب تک میں اس چٹان پر بیٹھا رہوں گا، میرے پاس میری سوچوں کے سوائے کچھ بھی نہ ہو گا۔ در اصل میں تو ہوں ہی اس لئے کہ میرے اندر کہیں سوچوں کے چشمے ابل رہے ہیں اور جس روز یہ چشمے سوکھ جائیں گے۔ یہ چٹان کسی اندرونی دھماکے کے نتیجے زیر اثر اپنا وجود کھو بیٹھے گی اور میں زرد پتے کی طرح اپنے آپ سے ٹوٹ گر جاؤں گا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک میں اس چٹان پر بیٹھا رہوں گا۔ سوچتا رہوں گا اور جب تک سوچتا رہوں گا۔ اس کا انتظار کرتا رہوں گا۔

وہ اس وقت بھی مجھے دور سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اوجھل کب ہوئی تھی، وہ ہواؤں کی طرح میرے چار سو پھیلی ہوئی ہے اور میں کائنات کی کسی بھی شے کو دیکھ کر اسے دیکھ لیتا ہوں کیونکہ زندگی کے ہر حسن میں اسی کا پرتو ہے۔

لیکن آج تو وہ ہو بہو چلی آ رہی ہے۔ میں صدیوں کے

فاصلوں سے بھی اُسے پہچان رہا ہوں، اِس وقت وہ وادی کے سبزہ زاروں سے گذرتی ہوئی زرد مائل پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی خراماں میری ہی جانب بڑھ رہی ہے اور ہوائیں اُس کے بدن کی سوگندھ اپنے بالوں میں سجائے سائیں سائیں کرتی ہوئی میرے چاروں طرف رقص کرتی جا رہی ہیں۔ اُس کے قدموں کے نشان فاصلوں کی کالی چادر پر ستاروں کی طرح دمکتے جا رہے ہیں۔ اور وہ اپنے چہرے پر لاکھوں سورجوں کا نور سجائے قدم بہ قدم خیال در خیال اِس چٹان کی جانب کھنچی چلی آ رہی ہے۔ جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں کیوں کہ .... یہی چٹان اُس کی آخری منزل ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی یہاں پہنچ جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتے آتے اُسے ایک سال لگ جائے۔ یا ایک صدی یا ایک جگ لیکن ہر زمانے میں اُسے میری تلاش رہے گی اور مجھے اُسی کا انتظار کیوں کہ وہ میری زندگی کا وہ خوبصورت حصہ ہے جو مجھ سے بچھڑ چکا ہے اور بچھڑ کر وہ گھر گھر بھٹکا ہے۔ کوکھ کوکھ جنما ہے۔ پھولا ہے پھیلا ہے اور جوان ہوا ہے پھر جوان ہو ہو کر میری ہی جانب بڑھا ہے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ بڑھتے بڑھتے وہ تھک گیا اور تھکتے تھکتے وہ بیت گیا لیکن ہر بار بیت بیت کر وہ پھر جنما۔ نیا اور تازہ دم ہو ہو کر میری جانب لپکا ہے کہ میرا وجود ہی اُس کی آخری منزل ہے اور جب تک منزل نہیں ملے گی مکتی نہیں ملے گی اور جب تک مکتی نہیں ملے گی تلاش اور انتظار کا

سفر جاری رہے گا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ ایک روز اس چٹان تک آپہنچے گی اور میں اپنے آپ سمیت اُس میں لین ہو جاؤں گا۔ وہ لمحہ وقت کی معراج ہو گا۔ تب وادیوں کے پھول خوشی سے لہلہا اُٹھیں گے، برف کی ٹوپیاں پہنے ہوئے کوہستانی سلسلے اپنے جھرنوں سے گراتے ہوئے شفاف پانیوں سے سنتور بجانے لگ پڑیں گے۔ آسمان رِم جھم رِم جھم برس پڑے گا، دھرتی بسنت بہار کی اوڑھنی اوڑھے اور اندر دھنش کی مالائیں پہنے ہوئے کیسریا رنگ میں رنگ جائے گی اور ماحول سکون اور تسکین کی ہواؤں سے سنسا اُٹھے گا اور پھر یوں ہو گا کہ اُس لمحے کی راحت میں پگھل کر وہ ختم ہو جائے گی اور میں ختم ہو جاؤں گا اور ہمارے درمیان صرف ہم ہی ہم رہ جائیں گے۔ چونکہ اُس وقت ہم اپنے آپ سے مل چکے ہوں گے۔ اس لئے ہمارا مکمل روپ اپنا آپ دھارن کرے گا۔ اور پھر تمام آرزوئیں اور خواہشیں میلے کپڑوں کی طرح ہمارے جسموں سے اُتر جائیں گی اور ہر قسم کی ترشنا سے نجات ملے گی۔

لیکن کس کو معلوم کہ وہ ملن کتنا دُور ہے اور یک جہتی کے وہ حسین لمحے اپنے آپ کو کن دشاؤں میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ ابھی تو بہار کے موسموں کا کہیں سُوراغ نہیں نہ جانے اُس کے قریب آتے آتے کتنے جنموں سے گذرنا پڑے گا۔ کتنے جسموں میں جھانکنا پڑے گا پر اُس کے بغیر تو کہیں بھی اپناپن نصیب نہیں۔ کبھی کبھی تو اِس

تلاش اور جستجو کے سفر میں اس بات پر بھی شک ہونے لگتا ہے کہ جس چیز
کو میں کھوج رہا ہوں وہ ہے بھی کہ نہیں یا میں خود کیا ہوں، ہوں بھی کہ نہیں
لیکن اگر میں کچھ بھی نہیں تو وہ کون ہے جو میری کشش سے کھنچتی چلی آرہی
ہے۔ کیونکہ جو چیز ہوا نہیں کرتی وہ دوسروں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی
اس لئے میں جو کچھ بھی ہوں میں ہوں، بلکہ میں تو اُس ستارے کی طرح
ہوں جس سے وہ وقت کے کسی شدید حادثے میں ٹوٹ گری ہے۔ پر ابھی
تک میری کشش کے اندر ہے۔ ہم کتنی دیر کے بعد بھی ایس آخر ملنا تو ہم
کو ہی ہے۔

لیکن یہ کیا آتے آتے اُس کی سمت کیوں بدل رہی ہے
دیکھتے ہی دیکھتے یہ فاصلہ کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ ایک بار پھر میری
آنکھوں سے اوجھل ہو رہی ہے اور فاصلوں کی کالی چادر وسیع سے
وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور راستے کا کوئی خوفناک موڑ یا وقت کا
کوئی شدید لمحہ اُسے نگل رہا ہے۔

مجھے اب اُٹھنا چاہیئے، اُس کی کھوج میں نکلنا چاہیئے
پر میں تو اس چٹان سے منسلک ہوں جس میں میرے پاؤں دھنسے ہوئے
ہیں اور جب بھی میں اپنے آپ کو اس چٹان سے توڑوں گا خود اپنا آپ
کھو بیٹھوں گا میں تو ایک قیدی ہوں اور اس چٹان پر بیٹھا ہوا دن گذار
رہا ہوں اور اس چٹان کے نیچے وقت کا دریا بہہ رہا ہے۔ اور ساعتوں

کی لہریں مجھے چھوتی ہوئی گذر رہی ہیں اور اِس چٹان کے اوپر وشو کرماں
کا سنگھاسن ہے جہاں بیٹھ کر سرو شکتی مان تمام عالم کو اپنی نظروں
کی جنت میں رکھے ہوئے ہے اور میرے چار سو پراکرتی پھیلی ہوئی ہے
اور پُرش موہ، مایا اور تشکیک کی ڈوریوں میں بندھے ہوئے پراکرتی
کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ مجھے اِس چٹان پر بیٹھے ہوئے پُرش
اور پراکرتی کا یہ کھیل صاف دکھائی دے رہا ہے۔ شہر گاؤں گھر راستے
میری نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔ میں ہر چیز دیکھ رہا ہوں، یہ
ایک وہ ہے کہ ڈوبتے سورج کی طرح نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہے
اُس کی جدائی کا سوچتے ہی میں تڑپ اُٹھا ہوں اور مجھے لگ رہا ہے
کہ میں اپنے اندر سے اُبل پڑوں گا اور اپنی نس نس سے پھوٹ پھوٹ
کر اُس کی جانب بہہ نکلوں گا۔ میں تو انگ سے انگ ملا کر اُس کے انگ
انگ میں سما جانا چاہتا ہوں۔

لیکن میں تو اس چٹان کا قیدی ہوں اور جسم کی اونچی اونچی
دیواریں میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ پر اس وقت جب وہ ایک
بار پھر مجھ سے بچھڑ رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ کو تمام بندھنوں سے آزاد
کرنا ہوگا تاکہ اُس تک پہنچ سکوں۔ میں اِس کوشش میں لگا ہوں کہ مجھے
یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آسمان گڑگڑا رہے ہیں۔ نہیں شاید یہ پہاڑ
کڑکڑا رہے ہیں۔ نہیں شاید یہ درخت ٹوٹ رہے ہیں۔ نہیں شاید کوئی

میرے مکان کو پیٹ رہا ہے۔ نہیں شاید کوئی دروازے پر دستک
دے رہا ہے تبھی مجھے یاد آیا کہ یہ تو وہی ہوگی جو زندگی کے اس
موڑ پر الوداع کہنے آئی ہے۔ اور سچ یوں ہوا کہ اُسے خوش آمدید کہنے
کے لئے ایک بار پھر میں اپنے جسم میں داخل ہو گیا تا کہ رخصت کے
وقت اُس کے چمکتے ہوئے چہرے کے نور کو دل کے گوشوں میں مقید
کر سکوں کہ تنہائیوں اور تاریکیوں کے سفر میں کچھ تو ساتھ رہے ؛





